جہانِ غالب
18
Ga

جہانِ غالب

یادگار حکیم عبدالحمیدؒ

جلد: 9 شمارہ۔ 18

نگراں

پروفیسر شمیم حنفی

مدیر

ڈاکٹر عقیل احمد

غالب اکیڈمی، بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی

جہانِ غالب

یادگار حکیم عبدالحمیدؒ

جلد:9 شمارہ:18 جون 2014 تا نومبر 2014ء

قیمت فی شمارہ:-/20 روپے

قیمت سالانہ:-/40 روپے

ڈاک سے: -/50 روپے

کمپوزنگ: بشریٰ بیگم

طابع و ناشر

ڈاکٹر عقیل احمد

سکریٹری: غالب اکیڈمی

بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی۔110013

فون نمبر:9868221198, 24351098

ای میل:ghalibacademy@rediffmail.com

ویب سائٹ:www.ghalibacademy.org

ISSN -2349-0225

پرنٹر، پبلشر ڈاکٹر عقیل احمد نے غالب اکیڈمی کی طرف سے شیروانی آرٹ پرنٹرس 1480 گلی حکیم اجمل خاں، بلیماران، نئی دہلی سے چھپوا کر غالب اکیڈمی 168/1 بستی حضرت نظام الدین نئی دہلی 13 سے شائع کیا۔ ایڈیٹر: عقیل احمد

فہرست

اس شمارے میں

جہان غالب کا اٹھارواں شمارہ پیش خدمت ہے۔ اس سال اکیڈمی کی سرگرمیوں میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔ روایتی پروگراموں کے ساتھ نئے پروگراموں کا انعقاد بھی کیا گیا ہے۔ اکیڈمی مرزا غالب کے یوم ولادت کے موقع پر ہر سال خصوصی لیکچر کا اہتمام کرتی ہے۔ اس سال 27/دسمبر 2013 کو پروفیسر ابوالکلام قاسمی صاحب نے مرزا غالب اور دانش حاضر کے عنوان سے خصوصی لیکچر دیا۔ اس میں انھوں نے کہا کہ ''غالب اردو کے کسی بھی شاعر کے مقابلے میں موجودہ زمانے کی آگہی اور معاصر صورت حال کے بہتر ترجمان دکھائی دیتے ہیں۔''

غالب کے ناقدین ومحققین کی پیدائش و وفات کو سو سال پورے ہو رہے ہیں جیسے سردار جعفری کی پیدائش کو سو سال پورے ہوئے تو مولانا الطاف حسین حالی کی وفات کو سو سال پورے ہو گئے۔ اسی مناسبت سے اس شمارہ کا دوسرا مضمون پروفیسر علی احمد فاطمی کا علی سردار جعفری کی غالب شناسی شامل ہے۔ اس شمارے میں کے بقیہ مضامین مولانا الطاف حسین حالی سے متعلق ہیں۔ جنوری 2014 میں اکیڈمی نے حالی پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے ایک کل ہند سیمینار کا انعقاد کیا تھا اس میں پڑھے گئے مقالے قارئین کے لیے شامل اشاعت کئے جارہے ہیں۔ اس سلسلے کا پہلا مضمون پروفیسر قاضی جمال حسین کا حالی اور نظم جدید ہے۔ مضمون میں خاص طور سے انجمن پنجاب کے جلسوں میں پڑھی گئی نظموں کا تجزیہ اس عہد کے تقاضے کے پس منظر میں کیا گیا ہے۔ دوسرا مضمون پروفیسر عبدالحق کا دیوان حالی کا نقش اول ہے جس میں انھوں نے دیوان حالی کے اشاعت نو کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ تیسرا مختصر جامع مضمون حالی اور

تفہیم غالب پروفیسر قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی کا ہے۔ چوتھا مضمون ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صدیقی کا حالی اور تعلیم نسواں ہے۔ جس میں مولانا حالی کی نظم چپ کی داد کے حوالے سے مولانا حالی کے افکار و نظریات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ پانچواں مضمون مظہر محمود صاحب کا مسدس مدوجزر اسلام ایک زوال پذیر معاشرے کا لازوال رزمیہ شامل ہے۔ اس میں یہ کہا گیا ہے کہ مسدس حالی اصلاح ملت پر ایک لافانی شاہکار کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کی ضرورت، اہمیت، معنویت افادیت جتنی عہد حالی میں تھی آج بھی اس سے کم نہیں ہے۔ چھٹا مضمون الطاف حسین حالی خطوط کے آئینے میں ڈاکٹر شاداب تبسم کا ہے جس میں حالی کی مکتوب نگاری کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ آخری مضمون آفتاب عالم آروی کا حالی اور لفظ تنقید کی تحقیق ہے۔

آخر میں اکیڈمی کی سرگرمیوں اور کتابوں کی باتیں شامل ہے۔ اس طرح یہ شمارہ اپنے آپ میں حالی پر خصوصی نمبر ہوگیا ہے۔ امید ہے کہ گزشتہ شماروں کی طرح یہ شمارہ بھی پسند کیا جائے گا۔

ابوالکلام قاسمی
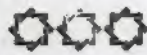
مرزا غالب اور دانش حاضر

شاعری اپنے مزاج اور ماہیت کے اعتبار سے اپنے مخصوص زمانے میں شاعر کے وجدان یا تجربات و مشاہدات کا عکس تو ضرور ہوتی ہے مگر معرض اظہار میں آتے ہی وہ لازمانی بھی بن جاتی ہے۔ اسی باعث کسی بھی بڑی شاعری کی وقتی معنویت اس کے لیے بہت جلد ناکافی محسوس کی جانے لگتی ہے اردو شاعری کی پوری تاریخ میں یہ بات جس حد تک مرزا غالب کی شاعری پر صادق آتی ہے اس حد تک اس کا مصداق کسی اور شاعر یا اس کی شاعری کو قرار دیا جانا مشکل ہے۔ یہی وہ بنیادی مقدمہ ہے جس کی بنیاد پر مرزا غالب کی عصری معنویت کو مختلف زمانوں میں متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ان کی شاعری اگر بعد کے زمانے کی فکری یا عملی صورت حال کا آئینہ بننے کی صلاحیت رکھتی ہے تو اس کے اسباب و علل کیا ہیں؟ گذشتہ تین چار دہائیوں میں غالب کی شاعری پر کبھی جدید ذہن کے حوالے سے، کبھی عصر جدید میں غالب کی معنویت کے نقطۂ نظر سے اور کبھی عہد جدید سے غالب کی مناسبت کے سیاق و سباق میں متعدد مضامین لکھے جا چکے ہیں، جن میں نمائندہ نقادوں نے اپنے اپنے طور پر غالب کی معاصر معنویت کی توجیہیں پیش کی ہیں، اور اس طرح کسی نے نظریاتی اور کسی نے تفہیمی انداز میں غالب کے شعری طریق کار اور لازمانی انداز فکر اپنے اپنے طور پر سمجھا ہے۔ بعض نقادوں نے غالب کے یہاں وہ کلیدی الفاظ تلاش کیے ہیں جو اپنی استعاراتی معنویت کے سبب کلام غالب میں ایسی طلسمی فضا تخلیق کرتے ہیں جو وقتی سے زیادہ لازمانی اور تاریخی سے زیادہ عصری تناظر کی حامل بن جاتی ہے۔ بعض لکھنے والوں نے بعد کے زمانے کی شاعری پر غالب کے اثرات کی نشان دہی کے ذریعہ غالب کی ہمہ گیری کا نقشہ کھینچا ہے، اور بعض نے روایتی موضوعات اور لفظیات کے برخلاف نسبتاً ایک نیا ڈکشن بنانے کے سبب غالب کو مختلف زمانوں میں بامعنی اور اثر انداز بنانے پر اصرار کیا ہے۔

غالب اور دانش حاضر کے مسئلے پر غور کرتے ہوئے پہلا سوال تو یہ سامنے آتا ہے کہ دانش حاضر سے ہماری مراد کیا ہے؟ تو اس ضمن میں پہلی وضاحت تو یہ ہے کہ یہاں دانش حاضر سے مراد معاصر Intellect بھی ہے اور ہماری عام عصری صورت حال بھی۔ اس صورت حال میں آج کے زمانے کی وہ عام سوجھ بوجھ سب سے پہلے شامل ہے جس کو بنانے میں تاریخی اور سماجی ارتقا کے تمام محرکات روبہ عمل رہے ہیں، جسے سائنس کی ترقی اور ہماری فکری اور سماجی حکمت عملی نے بڑی حد تک غیر قطعی بلکہ سیال انسانی رویوں میں تبدیل کردیا ہے۔ غالب کی عصری معنویت پر غور کرنے والے بیش تر نقادوں نے اگر غالب کے بعد سے لے کر آج تک کی شاعرانہ کاوشوں میں غالب سے کسبِ فیض کے رجحان کا ذکر کیا ہے تو اس کا سبب بھی غالب کے غیر قطعی رویے کو بتایا ہے تاکہ یہ واضح کیا جاسکے کہ عصری معنویت زمانی تغیر وتبدل کے ساتھ کیوں کر تبدیل ہوتی رہتی ہے۔

اگر ہم دانش حاضر کو عصر دانش وری کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کریں تو دوسرے فاضل نقادوں کی طرح پہلے اس بات کا تعین کرنا پڑے گا کہ آج کی دانش وری کن بنیادی مسائل اور سوالات سے نبرد آزما ہے؟ ویسے اس ضمن میں کسی تنقید نگار نے تشکیک کو معاصر دانش ورانہ سرگرمیوں کا محرک مانا ہے اور بعض نے تنہائی، یا مایوسی یا داخلی درد وکرب کو آج کے انسان کے اصل مسائل کی حیثیت دی ہے۔ اس موقع پر شاید یہ وضاحت نامناسب نہ ہوگی کہ گذشتہ صدی کے نصف اوّل میں بالعموم اور جدید ادبی رجحانات کے فروغ کے ساتھ بالخصوص جن فلسفیانہ موشگافیوں کے سبب تنہائی مایوسی اور انسان کی داخلی شکست وریخت سے جدید انسان کو مزاحم دیکھا گیا اس نقطۂ نظر میں ہماری اپنی سماجی اور ثقافتی صورت حال کی تشخیص کم شامل تھی، یا پھر اسے یوں کہیے کہ عالمی سطح کی حاوی فلسفیانہ فکر کو اپنی صورت حال پر مناسب یا نامناسب انداز میں منطبق کرنے کی کوشش زیادہ نمایاں تھی۔ مثال کے طور پر وجودیت کا فلسفہ رہا ہو یا نہلوم اور لایعنیت کے تصورات، ہمارا معاشرہ شاید نصف صدی پہلے تک اس نوع کے رویوں کا پوری طرح مصداق نہیں بن سکا تھا۔ مگر آج کی بدلی ہوئی صورت حال میں جب دنیا کے عالمی گاؤں میں تبدیل ہوجانے، ذرائع ابلاغ کے غیر معمولی وفور یا پھر کسی ایک جگہ پر کسی مخصوص فلسفیانہ رویے کے فروغ کو آنکھ

جھپکتے ہی عالمی سطح پر قبول کر لیے جانے کا امکان اپنی آخری حدوں تک پہنچ چکا ہے، تو کسی فکری اور فلسفیانہ زاویۂ نظر سے اپنی مناسبت تلاش کر لیے جانے کا امکان بھی زیادہ بڑھ گیا ہے۔ ایسے عالم میں آج کوئی بھی انسانی رویہ مشکل سے ہی مشرق ومغرب یا شمال وجنوب میں تقسیم کر کے دیکھ جاسکتا ہے۔ تاہم انسانی رویوں کے تنوع کو ہنوز کسی خاص نظریے یا اصلاح میں قید کر کے دیکھنا آسان نہیں رہ گیا ہے۔ اس لیے شاید یہ کہنا بے جا نہ ہو کہ دانش حاضر کی سب سے بڑی شناخت اس کا تنوع اور رنگا رنگی ہے۔ یہی سبب ہے کہ شعری اظہار کی ماہیت اور اس کے پس منظر میں موجود افکار تک کے بارے میں دانش حاضر نہ تو کسی فکر کو حتمی قرار دینے کی روادار ہے اور نہ شعری اظہار کو کسی مخصوص خانے میں رکھ کر دیکھنے کا انداز قابل قبول رہ گیا ہے اردو کے کلاسیکی شاعروں کے بارے میں قنوطی، رجائی، رند مشرب، صوفی یا انقلابی جیسے حصار قائم کر لینا اردو کی قدیم تنقید کا عام وطیرہ رہ چکا ہے۔ آج نہ تو کسی شاعر کو موضوعاتی حد بندی میں قید کرنا ممکن ہے اور نہ معاصر تنقید کا طریق کار اور نقطۂ ارتکاز ہمہ جہتی کے امکان کو محدود کرنے کا قائل رہ گیا ہے۔

مرزا غالب کی شاعری کو صدی، دو صدی بعد کے زمانے سے ہم آہنگ کر کے دیکھنے کی گنجائش یوں بھی پیدا ہو گئی ہے کہ گذشتہ برسوں میں شرح اور تعبیر کے نظریات میں بھی معنی کے اکہرے پن اور قطعیت سے انکار کا رجحان زیادہ نمایاں ہوا ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ خود کلام غالب بھی شارحین اور معتبرین کی شرح وتعبیر کے دائرے میں محدود ہونے سے انکار کرتا نظر آتا ہے۔ ہم اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہر طرح کا زاویۂ نظر غالب کے کلام میں نت نئے معنی کا امکان پیدا کرتا ہے اور کلام غالب کے وسیلے سے ہر طرز احساس اور نئے سے نئے نقطۂ نظر کا تناظر ہمارے سامنے معنویت سے لبریز شاعر کو لا کھڑا کرتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ متعدد اشعار میں استعاروں اور علامتوں کے شعر کی اوپری سطح پر نمایاں نظر نہ آنے کے باوجود بھی کلام غالب استعاراتی ہمہ جہتی اور معنوی وفور کا سر چشمہ بن جاتا ہے۔ اس معروضے کی مزید وضاحت کی غرض سے سر دست ایک ایسے شعر کو دیکھا جا سکتا ہے جس میں نہ تو فنی تدابیر کی بہتات ہے اور نہ بالواسطہ اظہار کا کوئی بڑا وسیلہ اختیار کیا گیا ہے۔ غالب کا بہت معروف شعر ہے

ہر قدم دوریٔ منزل ہے نمایاں مجھ سے میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

پہلی نظر میں یہ شعر نہ تو چونکانے والا لگتا ہے اور نہ اس میں کسی غیر معمولی مضمون کا شائبہ تک گزرتا ہے۔ مگر منزل کے لفظ کو اگر مرکز میں رکھ کر اس کے اردوگرد الفاظ کے درو بست اور تلازمات کے اہتمام کی نشان دہی کرنے کی کوشش کی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ منزل کے تلازمے کے طور پر قدم، دوری، رفتار، بھاگنا اور بیاباں ایک دوسرے سے پوری طرح مربوط اور ہم آہنگ ہیں۔ قدم کے ساتھ رفتار، دراصل دوری اور منزل کا پیش خیمہ ہے اور جب ہمارا ہر قدم منزل کو قریب لانے کے بجائے منزل سے دور ہوتے جانے کا سبب بن جائے تو جس رفتار سے قدم آگے کی طرف بڑھیں گے اسی رفتار سے دوریٔ منزل کا سلسلہ دراز ہوتا چلا جائے گا۔ اس ندرت خیال کی وضاحت کے باوجود اس شعر کا مضمون گو خاصا مانوس اور کثرت سے برتا ہوا معلوم ہوتا ہے مگر بنیادی الفاظ کی استعاراتی معنویت جس طرح معنی کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کر رہی ہے اس کے سبب پامالی کے بجائے اس مضمون میں انوکھے پن کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ مزید برآں یہ کہ جب ہم ایک اور زاویۂ نظر سے اس شعر میں انسانی تاریخ کے ارتقا کا منظر دیکھتے ہیں اور یہ پتہ لگانا چاہتے ہیں کہ آخر بنی نوع انسان کی آخری منزل ہے تو کیا ہے؟ دنیا کو جنت میں تبدیل کرنا، اسے اپنے لیے گوشۂ عافیت یا آرام و آسائش کا مثالی نمونہ بنانا یا تمام ناآسودہ انسانی خواہشات کی تسکین کا سامان بہم پہنچانا۔ یا پھر انسان کی تمام تگ و تاز اور سائنسی، فکری اور عملی کاوشوں کے ذریعے کائنات کے تمام مخفی اسرار اور رموز کو پوری طرح دریافت کرلینا۔ مگر صورت حال یہ ہے کہ بنی نوع انسان ارتقائی سفر کا ہر قدم اس سے اس منزل کے فاصلے کو بڑھائے جا رہا ہے اور جس رفتار سے انسان کا آگے کی طرف بڑھنا جاری ہے، اس کی مثالی منزل کا سراغ اسی رفتار سے دور ہوتا چلا جاتا ہے۔ اب اگر ہم غالب کے اس شعر کو ایک پیش پا افتادہ مضمون کی پیش کش کے طور پر بھی دیکھیں جب بھی رفتار اور قدم کے الفاظ معنی کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کرتے معلوم ہوتے ہیں اور سامنے کا مضمون بھی اپنی لسانی تشکیل کے اعتبار سے معنی آفرینی کا ایک تسلسل سا قائم کرلیتا ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ بنی انسان کی راہ میں ہزاروں پڑاؤ ضرور آئے جنھیں چھوٹی چھوٹی

منزلوں کا نام دیا گیا لیکن اس کی مثالی منزل تو ہنوز اس کی نگاہوں سے دور ہے۔ گویا منزلیں گرد کی مانند اڑی جاتی ہیں اور انسان کا سفر ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا۔ اس لیے کہ اس کی رفتار کی سرشت ہی دوریٔ منزل کو بڑھانے والی ہے۔

ان باتوں کا ایک مطلب یہ بھی ہوا کہ کلام غالب میں جس طرح محض لفظوں کے سیاق وسباق کی تبدیلی یا بدلے ہوئے استعاراتی تلازمات سے کبھی معنی تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح غالب کا شعری طریق کار ان کے اشعار کے زمانی تناظر کو بھی بدل دیتا ہے۔ انسانی ارتقا کی یہ منطق شروع سے رہی ہے کہ اگر انسان کی خواہشات کی تکمیل دیر سے ہوتی ہے تو نئی آرزوؤں اور تمناؤں کے پیدا ہونے اور اپنے لیے نئی نئی منزلیں متعین کرنے کا سلسلہ بھی دھیمی رفتار سے آگے بڑھتا ہے۔ جب کہ اس کے مقابلے میں آج کا انسان مادّی ترقی، سائنسی دریافت اور جلد سے جلد منزل سے ہم کنار ہونے کی ہوس کے جس نقطۂ عروج پر ہے، ایسے عالم میں اس کی اصل منزل اس سے مزید دور ہوتی جارہی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے گویا اس کا ہر قدم آگے بڑھنے کے ساتھ اسے منزل سے قریب نہیں کرتا بلکہ منزل کے آگے بھاگنے کے باعث اسے دوریٔ منزل کے آگے بھاگنے یا دور ہوتے جانے کے نقیضین یا متصادم لفظیات کی مدد سے جس طرح کا پیراڈوکس تخلیق کیا گیا ہے وہ آج کے متضاد جذبات، کیفیات اور حالات میں گزاری جانے والی زندگی سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ اس طریق کار سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ غالب کے اشعار کی جدلیاتی اور بسا اوقات طلسمی فضا، دانش حاضر کی مختلف الجہات حسیت اور ایک دوسرے سے متخالف رویوں کو زیادہ بہتر انداز میں اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ غالب کی شاعری بہ یک وقت مختلف مزاج اور افتاد طبع رکھنے والے جدید انسان کے لیے اس کی ذہنی اور جذباتی سیمابیت کے اعتبار سے زیادہ بامعنی ہونے کا تاثر قائم کرتی ہے۔

متذکرہ شعر کے حوالے سے انسان کی روز افزوں تمناؤں اور آرزوؤں اور ان کے تناسب میں اس کی قوت تسخیر کا ذکر آ گیا ہے تو اس موقع پر شعور و بصیرت سے لبریز اور ہمہ جہت معنوی امکانات کا حامل غالب کا معروف شعر بے ساختہ یاد آتا ہے:

ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقش پا پایا　　ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب

ایسا لگتا ہے کہ محولہ بالا دوریٔ منزل والے شعر میں جس طرح انسان کی ازلی نارسائی کو اس کی روز افزوں آرزوؤں کا مصداق مان کر معاصر زندگی کی مرکزی صداقت کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسی طرح اس شعر میں دشت امکاں کو تمنا کے پہلے قدم کے ساتھ دسترس میں لینے کے عمل اور دوسرے قدم پر قائم سوالیہ نشان کو کچھ زیادہ مرکوز انداز میں سمجھا جا سکتا ہے۔ امکان، ایک تجریدی صورت حال کا نام ہے جس کو دشت کی صفت سے متصف کر کے ایک لامحدود اور غیر قطعی استعارے کی تخلیق کی گئی ہے اور تجرید و تجسیم کے درمیان روبہ عمل استعارے کو ایک نقش پا کا محل وقوع بنا کر غالب نے پوری انسانی تاریخ کو اپنے استعاراتی بیان کے زیر نگیں کرلیا ہے۔ انسان اپنی تمنا کے دوسرے قدم کی بات اسی وقت زیادہ اعتماد سے کرسکتا ہے جب اسے معلوم ہو کہ اس کے پہلے نے قدم کہاں کہاں اور کن کن زمانی اور مکانی وسعتوں میں اپنے نقوش ثبت کر دیے ہیں۔ اس سوال کا جواب عین متوقع طور پر ہمیں شعر کے دوسرے مصرعے میں مل جاتا ہے کہ امکان کا دائرہ کتنا وسیع و عریض کیوں نہ ہو وہ ہے ایک ایسی دنیا جس کی آخری حدوں پر انسان کے نقش قدم ثبت ہو چکے ہیں یا اگر زیادہ وضاحت سے کہا جائے تو یہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ انسان کی دریافت اور کارکردگی کا ماحصل ہر ناممکن کو ممکن بنالینا رہا ہے، تو بھلا انسان کی تمنا کے دوسرے قدم کی دسترس کہاں تک ہوگی؟ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس شعر کے دائرۂ کار میں محض یہ بات شامل نہیں کہ غالب محض انسان کی کامرانیوں اور قوتِ تسخیر کا اعتراف کرانا چاہتے ہیں، بلکہ یہ اندیشہ بھی سر اٹھاتا ہے کہ کہیں ہماری تمناؤں کا دوسرا قدم خود اپنی ہلاکت، یا ترقی معکوس یا نسل انسانی کی تباہی و بربادی کے راستے پر تو نہیں پڑے گا۔ اس طرح زیر بحث شعر کی پہلی سطح جس طرح بنی نوع انسان کی مثبت ترقی یا تیز رفتاری کی ترجمان معلوم ہوتی ہے وہیں اس کی دوسری جہت بعض اندیشوں، منفی رویوں اور تعمیر کے بجائے تخریب کے منفی ارتقا کا بھی امکان پیدا کرتی ہے۔

یہ تو رہی زیر بحث شعر کی استعاراتی تعبیر، تاہم انسان کی بعض تاریخی دریافتیں اور تسخیری کامرانیاں اس شعر کی تفہیم کی بعض اور جہات کو روشن اور وسیع کرتی ہیں۔ ذرا تاریخ میں مرزا

غالب کے زمانے پر ایک نگاہ ڈالیے اور پھر سائنس کی دریافتوں کے حوالے سے عصر حاضر کے انسان کی جادوئی قوتِ تسخیر کی کوئی مثال سامنے رکھیے تو واقعاتی طور پر غالب کا یہ شعر بعض حیرت خیز صورت ں کی پیش گوئی بن جاتا ہے۔ مرزا غالب کی وفات1869 میں ہوئی تھی یعنی 1969 کے پورے سو سال قبل اور غالب کے انتقال کے ٹھیک ایک سو سال بعد ٹھیک 1969 میں انسان کے قدم پہلی بار آرم اسٹرونگ اور اس کے دو ساتھیوں کے ہمراہ چاند پر نہ صرف پہنچتے ہیں بلکہ انسان چاند کی سرزمین پر انسانی فتح و کامرانی کا جھنڈا بھی گاڑ دیتا ہے۔ اس طرح اگر یہ دشتِ امکاں چاند تھا جب بھی انسان نے اس پر اپنا نقش قدم ثبت کر کے انسانی ارتقا کی ایک نئی تاریخ رقم کردی۔ اس لیے اس بات کو ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ انسان کی تمنا کا پہلا نقشِ قدم جب چاند کو اپنی دسترس میں لے چکا ہے تو اب انسان خدا سے سوال کرتا ہے کہ ہماری تمنا کا دوسرا قدم کہاں پڑے گا۔ سورج پر، مریخ پر، فلک اعلیٰ پر، یا پھر ہم اپنے اگلے نقش قدم کے ساتھ خود اپنی ہی تباہی و بربادی اور ہلاکت کو دعوت دیں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ ہلاکت انسان کا مدعا اور مقصد تو نہ ہوگی مگر خیر کی تلاش میں شر، کامیابی کی جستجو میں ناکامی اور حد سے بڑھی ہوئی خواہشوں اور تمناؤں کے حصول کی آرزو، بسا اوقات پوری کائنات کی بربادی پر بھی منتج ہوسکتی ہے۔ انسان نے دنیا کو تباہی کے دہانے پر پہنچا دینے والی ایٹومک انرجی کو اس لیے فروغ نہیں دیا تھا کہ وہ اس سے بربادی پھیلائے مگر اکثر ذاتی ملکی اور نسلی برتری اور تحفظ کی خاطر دوسرے لوگوں یا نسلوں کو تباہی کے امکان سے دوچار کردینا تاریخ عالم میں بار بار کا دہرایا ہوا عمل ہے۔ جس کی انتہا یہ ہوسکتی ہے کہ ارتقا کی اندھی دوڑ میں ہم اس کا احساس ہی نہ رکھیں کہ ساری کائنات کو تسخیر کر لینے کے نشے میں کہیں اب ہم کسی تخریبی منزل کی طرف تو گامزن نہیں ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہر دور کے انسان کے لیے امید و بیم کی صورت حال یا پھر ساری شادکامیوں کے درمیان سے متوقع یا غیر متوقع طور پر زیاں کاری کے اندیشے میں مبتلا انسان کی تسلی کی خاطر غالب جیسا شاعر اشک شوئی یا ہمدردی کا اندازہ کیوں اختیار نہیں کرتا۔ اس کا جواب سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ غالب کی نگاہ زندگی کی بنیادی حرکیات اور دنیا میں موجود تضادات پر

ہمیشہ مرکوز رہتی ہے۔ وہ ناصح یا اخلاقیات کا درس دینے والے مبلغ کا کردار ادا کرنے سے زیادہ وہ ایک مدبر یا دانش ور کا کردار ادا کرنے کو ہی اپنا موقف بناتے ہیں۔ اس لیے ان کو ہماری تعمیر میں تخریب اور شادکامیوں میں شدید رنج ومحن کا ادراک سب سے پہلے ہوتا ہے۔ وہ اگر کسان کے خون گرم اور محنت و جانفشانی کو فصل پیدا کر لینے کا ایک خوش آئند اقدام قرار دیتے ہیں تو اس کے ساتھ ہی اس عمل کو کھلیان پر بجلی کے گرنے کا پیش خیمہ بھی کہنے میں کوئی تکلف محسوس نہیں کرتے۔

میری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا

ظاہر ہے کہ ایک فلسفی اور دانش ور کا تفکر بھی ہے اور فکر مندی بھی۔ عام انسان کس تضاد کو بادی النظر میں نہیں دیکھ پاتا، غالب اس کو دکھلاتے ہیں، عبرت کی صورت حال سے دوچار کرتے ہیں اور حیرت واستعجاب کی صورت میں ہماری بصیرت میں اضافہ کر دیتے ہیں۔ انسان اپنی کامرانی کی سرشاری کے نشے میں جسے جان کر بھی نہیں مانتا غالب اس سرشاری کے اندر رینگتی ہوئی دیمک کی سرسراہٹ کو پہلی نظر میں ہی محسوس کر لیتے ہیں۔ غالب کے تحت البیان میں یہ بات مخفی رہتی ہے کہ اگر پوری حقیقت پسندی کے ساتھ زندگی کی سچائیوں کا سامنا کرنا ہے تو اس کی داخلی کش مکش اور جدلیات کو فراموش کر کے ہی کرنا ہوگا۔ انھیں معلوم ہے کہ زندگی گزارنے کی شرائط کچھ ایسی سخت اور صبر آزما ہیں کہ انسان کے لیے ان کی مثبت پہلوؤں کو قبول کر لینا اور منفی عناصر کو نظرانداز کر دینا ممکن نہیں۔ اس لیے عہد قدیم کے معصوم اور محدود تمناؤں والے انسان کے مقابلے میں آج کے متمدن مگر مادّیت پرست اور خود مرکزیت کے اسیر انسان کا نفسیاتی طور پر خود اپنی پیدا کردہ مشکلات اور خطرات سے نبرد آزما ہونا ناگزیر ہو کر رہ گیا ہے۔ اسی باعث جب وہ کہتے ہیں کہ:

سراپا رہن عشق و ناگزیر الفت ہستی عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

تو ایسے کسی بھی اعتراف میں شاعر کا تجربہ اس قدر اہم نہیں معلوم ہوتا جس قدر برق کی عبادت اور حاصل کے افسوس کے استعاروں کے ذریعہ پوری کیفیت نمایاں ہو جاتی ہے۔ یہاں دوسرا مصرع خالص استعاراتی بیان ہے مگر یہ استعارے محض عشق اور الفت ہستی کے تضاد کو نمایاں نہیں کرتے بلکہ انسانی تجربے میں قدم قدم پر حصول مسرت کی راہ میں درپیش کانٹوں اور مشکلات کا

بھی احاطہ کر لیتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو متعدد مقامات پر غالب اپنی تمام کاوشوں کو خرابی کی زد پر دکھانے پر اصرار نہ کرتے اور اپنی محدود اور مسدود صورت حال تک میں زندگی کے اہمال اور بوالعجبی کو بھی وقتی طور پر ہی سہی بامعنی بنانے کی کوشش نہ کرتے۔

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغ اسیر کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غالب کا طرزِ احساس درحقیقت استعاراتی یا علامتی طرز احساس ہے۔ زندگی کی غیر معمولی وسعت اور تنوع میں کسی بنیادی منطق کی تلاش اور اس منطق کی بنیاد پر کسی خاص استعارے یا متعدد استعاروں کے ایک سلسلے کو اپنے لسانی ڈھانچے سے ہم آہنگ کر دینے کی حکمت عملی۔۔ یہی سبب ہے کہ غالب کے استعارے کسی مرکزی تجربے کو اس کے تمام لوازم کے ساتھ مجتمع کرنے یا سمیٹنے سے عبارت بن جاتے ہیں۔ اس رویے کا نتیجہ یہ ہے کہ جہاں کہیں وہ زندگی کے تجربے کی طرف اشارہ کرتے ہیں تو واحد متکلم کا تجربہ کہیں پیچھے چھوٹ جاتا ہے اور اس کی پیش کش میں معاون استعارات کا دائرہ کار محرک تجربے سے کہیں زیادہ جامع اور دوررس بن جاتا ہے۔ اس طریق کار میں استعارہ ہی لسانی اظہار کا جز ولاینفک بنا رہتا ہے اور اسی سبب سے معنی آفرینی ان کی استعاراتی زبان کی بنیادی صفت بن جاتی ہے۔ اتفاق سے شمس الرحمٰن فاروقی نے بھی اپنے ایک مضمون میں غالب کی استعارہ سازی پر جن الفاظ میں اپنا نقطۂ نظر ظاہر کیا ہے وہ دراصل غالب کے اسی نوع کے شعری طریق کار اور انسانی رویے کے بعض گہرے مضمرات کی نشان دہی کرتا ہے۔

> ''غالب کے یہاں استعارہ ایک خارجی صفت نہیں بلکہ شعر کی ہیئت ہے اور شعر میں حسن پیدا کرنا اس کا ثانوی عمل ہے۔'' یا یہ کہ:
>
> ''غالب کے کلام میں استعارہ کا اولین عمل مختلف معنی کو یکجا کرنا ہے۔ معنی آفرینی کو غالب جس درجہ اہمیت دیتے تھے، اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ انھوں نے کسی شاعر کی اس سے زیادہ تعریف نہیں کی کہ وہ معنی آفرینی تھا۔''

غالب کے اس طریق اظہار کو جدید زندگی کی گھر دری سچائیوں کے بیان میں جس طرح ماقبل کے

اشعار کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے اسی طرح بعض ایسے تجربات جو تجربہ کم اور معاملہ بندی سے زیادہ قریب معلوم ہوتے ہیں انھیں بھی سامنے رکھنا ضروری ہے۔ اس طرح کے مضامین میں بھی وہ اپنی ذات اور باہر کی کائنات کے درمیان ایک ایسا رشتہ ڈھونڈھ نکالتے ہیں کہ مضمون کی نوعیت ہی تبدیل ہوکر رہ جاتی ہے۔ ان کا ایک مشہور شعر جو زبان زد خاص و عام ہے اور جس کا مضمون بھی پیش پا افتادہ ہے اور شعر میں بھی روایتی موضوع کی تکرار کے علاوہ کچھ اور نہیں، کچھ یوں ہے۔

یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہل جہاں دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہوگئیں

اب ذرا دیکھیے کہ اس تجربے کے بعض دوسرے پہلوؤں کو نمایاں کرنے کی خاطر جب غالب ایک اور شعر میں بعض نئی تراکیب اور نئے استعارے استعمال کرتے ہیں تو مضمون میں کن جہات کا اضافہ ہو جاتا ہے اور ذات کا داخلی تجربہ کائنات کے خارجی مظاہر سے کیوں کر مدغم ہو جاتا ہے۔

کس کہ جوش گریہ سے زیروزبر ویرانہ تھا چاک موج سیل تا پیراہن دیوانہ تھا

یہاں جوش گریہ اور پیراہن دیوانہ ایک طرف ہے اور ویرانہ چاک موج سیل دوسری طرف، مگر چاک یا شگاف، دونوں کے درمیان کچھ اس طرح مشترک ہے کہ سیلاب کی موج کا چاک اور دیوانے کے پیرہن کا چاک ایک دوسرے سے مربوط ہوکر اپنے سلسلے کو ذات سے لے کر کائنات تک دراز کر دیتا ہے۔

غالب کے حوالے سے غزل میں تجربے کی نوعیت اور اظہار کی سطح پر اس کی قلب ماہیت کے مسئلے کو کلیم الدین احمد نے غزل کی ایک صنفی خصوصیت کا نام دیا ہے۔ حالاں کہ اسی صنفِ سخن میں ربط وارتقا کے فقدان پر وہ ہمیشہ معترض رہے ہیں:

> ''غزل کی کمی یا خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں تجربات بہت عام صورت میں اپنی خصوصیت سے الگ ہوکر ظاہر ہوتے ہیں۔ وہ خصوصیتیں جو شاعر کے ماحول اور اس کی شخصیت سے متعلق ہیں، فنا ہو جاتی ہیں اور تجربات عام اور غیر متعین شکل میں نظر آنے لگتے ہیں۔''

تجربے کے عدم تعین اور اس کی تعمیم کے مسئلے کو سب سے بہتر انداز میں غالب کے اشعار کے حوالے سے سمجھا جا سکتا ہے۔ بیش تر صورتوں میں غالب کا تجربہ ان کے زمانی حوالے اور ذاتی

علائق سے کٹ کر اپنا رشتہ بعد کے زمانے بلکہ ہمارے زمانے سے قائم کر لیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بھی غالب کا وہ امتیاز ہے جو انھیں دانش حاضر سے مربوط کر دیتا ہے۔ اس لیے کہ دانش حاضر کا اطلاق آج کی فکر، آج کے تجربے اور درپیش مسائل پر عہد حاضر کے انسان کے ردعمل سے تو ہے ہی مگر آج کی دانش جس جس لہجے سے غالب کو اپنے لیے بامعنی اور کارآمد پاتی ہے، اس سے بھی ہے۔ اپنے اعتراف میں کلیم الدین احمد جس بات پر زور دینا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ غزل کی صنف کو دوسروں نے جس طرح بھی برتا ہو، مگر اس ضمن میں غالب اپنا یہ امتیاز قائم کرتے ہیں کہ وہ اپنے شعری اظہار میں اپنے ماحول اور شخصیت سے متعلق عناصر کو منہا کر کے کچھ ایسی وسعت پیدا کر دیتے ہیں کہ معنی کا عدم تعین ان کی غزل کی سب سے نمایاں خصوصیت بن جاتی ہے۔ کلیم الدین احمد نے غزل کی صنف کو نیم وحشی صنفِ سخن کا نام دے کر ربط و ارتقا کے فقدان پر جس شدت سے اعتراض کیا، اس موقف پر وہ اردو شاعری پر ایک نظر اور عملی تنقید' میں ہر شاعر کے جائزے کے دوران قائم رہے۔ مگر جب معاملہ غالب کا آتا ہے تو وہ غالب کو غزل کے صنفی نقائص کی تلافی کرنے والا اور اس صنفِ سخن کو پوری جامعیت اور امکانات سے آشنا کرنے والا شاعر قرار دینے میں کوئی تکلف نہیں محسوس کرتے:

> ''غالب کے آرٹ کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ اس نے غزل، خصوصاً شعر مفرد کی تنگی کو وسعت میں تبدیل کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ دو مصرعوں کی بساط ہی کیا ہے۔ اس میں گنجائش بہت کم ہے۔ غالب کوشش کرتے ہیں کہ ایک شعر میں مختلف خیالات وجذبات یا ایک ہی خیال، ایک ہی جذبے کے مختلف پہلوؤں کو سمیٹ لائیں...... غالب ایک خیال کو کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ دوسرے باتوں کی طرف توجہ جا پڑتی ہے اور شعر پڑھ کر ذہن ان دوسری باتوں کی جستجو میں لگ جاتا ہے۔ گویا محشرستان خیال کا دروازہ کھل جاتا ہے، اور غالب کا شعر اس دروازے کی کلید ہے۔''

قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل کھیل بچوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کلیم الدین احمد اپنے سخت گیر تنقیدی رویے کے باوجود یہ غالب کی

انفرادیت اور ہمہ گیری کا اعتراف کرتے ہیں۔ شاید اس باعث خود غالب نے بھی اپنے الفاظ کو گنجینۂ معنی کا طلسم کا نام دیا ہے اور ہر نئی قرأت کے ساتھ اس طلسم کا کوئی نہ کوئی نیا پہلو ہم پر منکشف ہوتا رہتا ہے۔ دراصل یہ طلسم اس سریت کا دوسرا نام ہے جس کی تشکیل مختلف اشعار میں غالب بالکل مختلف اور بدلے ہوئے انداز میں کرتے ہیں۔

باغ تجھ بن گل نرگس سے ڈراتا ہے مجھے ۔۔۔ چاہوں گر سیر چمن آنکھ دکھاتا ہے مجھے

مانع وحشت خرامیہائے لیلیٰ کون ہے ۔۔۔ خانۂ مجنوں صحرا گرد بے دروازہ تھا

ہو سکے کیا خاک دست و بازوئے فرہاد سے ۔۔۔ بے ستوں خواب گرانِ خسرو پرویز ہے

نہیں گر سرو برگ ادراک معنی ۔۔۔ تماشائے نیرنگ صورت سلامت

بعد کے زمانے میں مرزا غالب کی شاعری کی معنویت کے نت نئے انطبقات اس لیے بھی نمایاں ہوئے ہیں کہ غالب کے تجربے کی پیچیدگی اور اس کا ہمہ جہت اظہار بعد کی صورت حال سے پوری طرح ہم آہنگ معلوم ہوتا ہے۔ متعدد نقادوں نے اس مسئلے کو سمجھنے کی خاطر کبھی غالب کے شعری بیان کی عدم قطعیت کو اس کا سبب بتایا ہے اور بعض نے آج کی موجودہ صورت حال میں موجود شاعری کرنے والے نئے سے نئے شاعروں سے بھی کہیں زیادہ غالب کو اپنے مستقبل کا نباض بتانے پر اصرار کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ غالب کسی وقوعے کو واقعے کی سطح پر برتنے کے بجائے اس میں موجود مطلق قدر کا انتخاب کر لیتے ہیں۔ مگر خلیل الرحمٰن اعظمی نے عصر جدید میں غالب کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے اور باتوں کے علاوہ اس بات کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا ہے۔ ان کی تحقیقی چھان بین کے سبب غالب کی نفسیات میں موجود تصادم کی کیفیت اور زندگی کی کش مکش کے ہر پہلو کی عکاسی نے ان کے اشعار میں پہلوداری کی دریافت آسان کر دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''غالب کی سوانح کے سلسلے میں ہماری زبان کے بلند پایہ محققین نے اپنی چھان بین کا دائرہ بہت وسیع کر دیا ہے جس سے غالب کا کلام روز بہ روز ایک نئی اہمیت کے ساتھ ہمارے سامنے آ رہا ہے۔''

اس ضمن میں انھوں نے قاضی عبدالودود، عبدالستار صدیقی، مولانا امتیاز علی عرشی، مہیش پرشاد،

اور مالک رام کا خصوصی ذکر کیا ہے۔ تاہم ان کی اس بات کو غالب کی تفہیم میں اس حد تک معاون قرار نہیں دیا جا سکتا جس حد تک غالب کی استعاراتی نفسیات اور شعری طریق کار کو اس کا سبب بتایا جا سکتا ہے۔ اس لیے ان کی نفسیات میں حقائق کو استعاروں میں بدل کر پیش کرنے کا جو رجحان نمایاں تھا اس کے باعث جو فنی طریق کار بروئے عمل آیا اس نے غالب کے کلام میں تلازماتی امکانات کو بہت بڑھا دیا۔ غالب اپنے زمانے میں بہت مقبول نہیں رہے اور اسی زمانے کی نام نہاد وعصری حسیت کے راست ترجمان اس لیے بھی قرار نہیں دیے گیے کہ ان کی شاعری کو زمانی حد بندیوں میں قید کر کے سمجھنا اس شاعری کی نوعیت کی نفی کرتا تھا۔ غالب، اگر اپنے لیے اظہار کے نئے پیکر تراشتے ہیں تو اس کا محرک بھی یہی ہے کہ وہ متعین سچائی کو بھی مطلق صداقتوں میں ڈھال لینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان کی غیر معمولی انفرادیت جو قدم قدم پر ان کے اپنے زمانے کے اصولوں سے ٹکراتی ہے تو اس کا تصادم کا اظہار سپاٹ انداز میں کرنے کے بجائے استعاراتی پیکروں میں کرتے ہیں اور یہی انداز ان کو ان کے بعد کے زمانے کی صداقت کا بھی ترجمان بنا دیتا ہے۔

کلام غالب کی شرح وتفسیر کے سلسلے میں الطاف حسین حالی کی یادگار غالب سے لے کر آج تک کی شرحوں میں ان کے اشعار کی تفہیم کو جس طرح ارتقا اور تغیر سے گزرا گیا ہے اس سے کہیں زیادہ ان تنقیدی نظریات وتصورات نے غالب فہمی کی جہات میں اضافہ کیا ہے جو گذشتہ نصف صدی میں خصوصیت کے ساتھ روبہ عمل آئے ہیں۔ اس ضمن میں جن تصورات نے متن پر ارتکاز یا تعبیر شعر میں فشار معنی کو اپنا مخصوص حوالہ بنایا ہے ان تصورات کا اطلاق کلام غالب پر زیادہ کیا گیا ہے۔ اس معاملے میں ہیئتی تنقید اور جدیدیت کے زیر اثر متن کی دبازت پر جس طرح زور دیا گیا ہے۔ اس کا مصداق بھی غالب سے زیادہ اردو کے کسی اور شاعر کو نہیں سمجھا گیا۔ اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں شرح وتعبیر کا معاملہ ہو یا نئے تنقیدی نظریات کا یا پھر معاصر دانش سے وابستہ مسائل کا، یہ تمام چیزیں غالب کی روز افزوں معنویت کا سر چشمہ بنتی رہی ہیں۔

اس بات میں کسی شک شبہ کی گنجائش نہیں کہ غالب نے زندگی کے تقریباً ہر پہلو اور انسان کے ہر طرح کے موڈ اور رویے کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے

بہرا ہوں مجھ کو چاہتے دن ہو التفات — سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر
سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری — تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے
عاشق ہوں یہ معشوق فریبی ہے مرا کام — مجنوں کو برا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے

جیسے سپاٹ، نیم مزاحیہ اور نیم اعترافی قسم کے متعدد اشعار کہے ہیں مگر ان کے کلام میں جہاں کہیں بھی مزاح یا اعتراف کا رویہ ملتا ہے وہاں ہجو ملیح یا Irony کی آمیزش ایسے اشعار میں ایک ایسی کیفیت بھی شامل کر دیتی ہے جسے لحۂ فکریہ کے علاوہ کوئی اور نام دینا مشکل ہے۔ مگر جیسا کہ ہم بخوبی جانتے ہیں کہ یہ انداز غالب کے مکمل یا غالب اظہار کا دسواں حصہ بھی نہیں ہے۔ اس کے برخلاف ان کی شاعری کا غالب رجحان اپنی زندگی، اپنے حالات اور اپنے گردوپیش سے بے اطمینانی کا ہے۔ یہ بے اطمینانی اکتاہٹ کی شکل میں کم، استفہام، استعجاب اور تفکر و تدبر کی صورت میں زیادہ ظاہر ہوتی ہے۔ اسی سبب سے اس نوع کے اشعار میں ان کا لہجہ حکیمانہ اور دانش ورانہ زیادہ ہو جاتا ہے۔ یہی وہ حکمت و دانش ہے جو ان کے جذباتی لمحات کو بھی کسی جذباتی لجلجے پن کے بجائے رکھ رکھاؤ اور پر وقار لہجے میں ظاہر کرتی ہے۔ وہ اکثر اپنے جذبات کو بھی فکر کے قالب میں ڈھال کر پیش کرتے ہیں۔ متعدد ایسے دانش مندانہ موضوعات ہیں جن کے بیان میں ان کے متقدمین اور معاصرین خود کو ناصحانہ اور مشفقانہ طرز بیان سے محفوظ نہیں رکھ پاتے، ایسے مقامات پر بھی مرزا غالب ایک دانش اور ایک شاعر دونوں کی ذمہ داریاں نبھاتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے بزرگ معاصر استاد ذوق جہاں ع بڑے موذی کو مارا نفس امارہ کو گر مارا، یا ''اے دوست کسی ہمدم دیرینہ سے ملنا بہتر ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر ہے۔'' جیسے ناصحانہ اور سر پرستانہ مشورے دیتے نظر آتے ہیں، غالب ایسے مقامات پر بھی زندگی کی حکمت عملی اور نصیحت کو بھی کسی نہ کسی قدر مطلق میں اس طرح ڈھال دیتے ہیں گویا کسی بڑی اور آفاقی حقیقت کا اظہار کر رہے ہوں۔ ان اشعار پر بھی ایک نگاہ ڈالیے تو اندازہ ہوتا ہے کہ زندگی کی عام صداقتیں بھی کس طرح غالب کے شعری طریق کار کا حصہ بن کر فکر و دانش کا سرچشمہ معلوم ہونے لگتی ہیں۔

بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے — جتنے زیادہ ہو گئے اتنے ہی کم ہوئے

اہل بینش کو ہے طوفان حوادث مکتب　لطمۂ موج کم از سیلیٔ استاذ نہیں
حسد سے دل اگر افسروہ ہے گرم تماشا ہو　کہ چشم تنگ شاید کثرت نظارہ سے وا ہو
ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر　کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے
ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں　ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگ گراں اور
بھرم کھل جائے ظالم تیرے قامت کی درازی کا　اگر اس طرۂ پر پیچ وخم کے پیچ وخم نکلے

ان تمام اشعار میں جس مضمون کو بھی اختیار کیا گیا ہے اس سے متعلق صورت حال کے تمام پہلوؤں کو دو مصرعوں میں سمیٹ لیا گیا ہے۔ یوں تو غالب کے پیچیدہ تجربات میں تہہ دار بیان کے باعث ابہام کا تاثر بھی پیدا ہوتا ہے مگر ابہام کے نام پر اگر ان اشعار میں کچھ ہے تو وہ بیان کی سری کیفیت ہے۔ زبان کے سلسلے میں اس بات کا خاص اہتمام ملتا ہے کہ ان کی زبان کا رکھ رکھاؤ اور وقار کچھ ایسا رہے کہ فکر و دانش کا بوجھ برداشت کر سکے اور مضمون کی نوعیت اور بیان کی بلاغت میں کسی ثنویت کا شبہ تک نہ ہو۔ متذکرہ اشعار میں جو مضمون بھی زیر بحث آیا ہے لازمانی ہے اور آج کی دانش وبینش کے لیے گذشتہ زمانوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی کار آمد اور بروقت معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے شخصیت کے عدم توازن کا مسئلہ ہو، نفسیاتی کش مکش میں مبتلا انسان کی داخلی الجھنیں ہوں یا پھر مصنوعی طور پر کبھی عہدہ، کبھی منصب اور کبھی سماجی حیثیت کے بل بوتے پر خود کو بلند قامت دکھانے جیسے مسائل ہوں یہ سب کے سب عہد حاضر سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ اس لیے کہ آج جذباتی یا نفسیاتی کش مکش اور آویزش جدید انسان کے لیے ماضی کے مقابلے میں، داخلی اور خارجی عدم توازن کا سبب زیادہ بنی ہوئی ہے۔

غالب کی شاعری کے ہر دور میں حقائق کے بارے میں حکیمانہ غور وخوض اور سنجیدہ رائے زنی کا یہ رویہ ملتا ہے۔ پرانے انداز نقد کی طرح ان کی شاعری کو محض خیال کی ندرت اور لب ولہجے کی انفرادیت کے دائرے میں سمیٹنا آسان نہیں۔ انسان کے طرز وجود پر غور وخوض، احتساب ذات اور تجربے کی پیچیدگی جیسے نکات اور رویوں کو سمجھے بغیر محض روایتی انداز میں نہ تو غالب کی تفہیم وتعبیر کا حق ادا کیا جا سکتا ہے اور نہ ان کے امتیازات کی نشان دہی کی جا سکتی ہے۔ غالب کے متقدمین

اور معاصرین ہی نہیں ان کے بعد کے شاعروں نے بھی عرصے تک محبت کے موضوع کو وفا، بے وفائی، غم جاناں اور غم دنیا کے مواز نے یا داخلی واردات اور خارجی معاملات سے آگے نہیں بڑھنے دیا تھا۔ مگر غالب تو بالکل انوکھے شاعر کے طور پر نمودار ہوتا ہے اور محبت کو بھی ایک نوع کی مجبوری اور چاہنے والے کے لیے دست وپا ہو جانے کا نام دیتا ہے۔ وہ پیمان وفا کو آج کی زندگی کے تقاضوں سے نبرد آزما انسان کی سرشت میں شامل آزادی کی خواہش کے منافی قرار دینے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ اس کا کہنا ہے کہ

مجبوریٔ دعوایِ گرفتاریٔ الفت
دستِ تہہ سنگ آمدہ پیمان وفا ہے

اسی طرح انسان ترقی کی جس دوڑ میں سرپٹ بھاگا جا رہا ہے اس میں نہ تو اس کی رفتار اس کے قابو میں ہے اور نہ سفر کے وسیلے اور اسباب اس کی گرفت میں۔ اس پوری صورت حال کو مرزا غالب رَخشِ عمر کے استعارے کی مدد سے کچھ اس طرح بیان کر دیتے ہیں کہ اس کا سیاق وسباق گذشتہ زمانوں سے کہیں زیادہ آج کے زمانے کا معلوم ہونے لگتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ زمانۂ حاضر کا انسان اپنی عزت نفس، خودداری، اپنے طنطنے اور رکھ رکھاؤ کے معاملے میں اپنے آباواجداد سے زیادہ حساس ہے۔ انسان کو اس کی عظمت اور برتری کا احساس اس کو متوازن اور معتدل رکھنے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ مگر کیا یہ حقیقت نہیں کہ اس کی وحشت، اس کا خوف، اس کی حیرت اور اس کی فطری بے اطمینانی اسے غالب کی زبان میں پوری طرح ایک ''آہوئے صیاد دیدہ'' کے مصداق بنائے ہوئے ہے۔

ممکن نہیں کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں
میں دشت غم میں آہوئے صیاد دیدہ ہوں

اس پورے پس منظر میں دانش حاضر کے لیے مرزا غالب کی شاعری کی معنویت ماضی کے کسی بھی زمانی حوالے سے زیادہ معلوم ہوتی ہے اور وہ اردو کے کسی بھی شاعر کے مقابلے میں موجودہ زمانے کی آگہی اور معاصر صورت حال کے بہتر ترجمان دکھائی دیتے ہیں۔

✿✿✿

پروفیسر علی احمد فاطمی

علی سردار جعفری کی غالب شناسی

پیغمبرانِ سخن کے دیباچے میں سردار جعفری صاف طور پر لکھتے ہیں:

''میں اپنے آپ کو نقادوں کی صف میں شمار نہیں کرتا اور میں نے پیشہ ور نقادوں کا سارویہ بھی نہیں اختیار کیا ہے۔ میرے لیے کبیر میر اور غالب کی شاعرانہ دنیا کی بازیافت خود میری شعر گوئی کے لیے ضروری ہے۔ میں جس نظریہ جمال اور نظریۂ تاریخ پر یقین رکھتا ہوں اور جو میرے اندر گذشتہ تیس برس میں رچ بس چکا ہے میں نے اس نظریے سے ان بزرگ شعراء کے کلام پر نظر ڈالی ہے۔ یہ کلام ابدی قدروں کا حامل ہے لیکن اپنے عہد سے بے نیاز نہیں ہے۔ وقت کی وہ روانی جو ماضی، حال اور مستقبل کو ایک بہتے ہوئے دریا کی شکل میں پیش کرتی ہے۔ اس کی موجوں میں شعروسخن بھی شامل ہیں۔'' (ص۔8)

ان جملوں کو بغور ملاحظہ کیجیے۔ دو باتیں اہم نکلتی ہیں اول تو یہ ہے کہ غالب فہمی ہو یا اقبال فہمی سردار جعفری نے تنقید نگاری سے زیادہ اپنی شعر گوئی کے لیے ضروری سمجھا۔ دوم یہ کہ کبیر میر اور غالب کے تعلق سے یہ دیباچے یا مقدمے 1958 اور 1965ء کے درمیان لکھے گئے۔ اس دور تک آتے آتے سردار جعفری کے فکر و نظر میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ ایک خاص قسم کی بلوغت بھی آچکی تھی نوجوان نقاد عمر رضا نے سردار جعفری پر ایک جامع اور بسیط مقالہ لکھتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے۔۔۔

"1960 کے آس پاس ان کے یہاں ایک استحکام اور ٹھہراؤ آگیا تھا۔ اس عہد میں انھوں نے بہت ادبی و فکری سمجھوتے کیے۔ ترقی پسندی میں در آئی انتہا پسندی کو خیر باد کہا اور کچھ صحت مند پہلوؤں کو قبول کرکے ایک نئے ادبی و فکری منظر نامے کی تشکیل کی۔'' (علی سراد جعفری۔ص۔448)

عمر رضا کے خیالات سے اتفاق کیا جا سکتا ہے لیکن یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ جسے انھوں نے تبدیلی کہا ہے ان میں تصوف اور بھگتی ایک اہم فکری پہلو ہے جو ظاہر ہے کہ نیا نہیں ہے لیکن سردار جعفری نے نئے سیکولر رویے کو پرانی صوفیانہ روایت میں تلاش کیا ہے اور یہ تلاش و تجزیہ ہی میر، کبیر اور غالب فہمی میں غالب نقطہ کے طور پر نظر آتا ہے۔ پیغمبرانِ سخن کے دیباچے کا ایک اور اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> ''کبیر کی شاعری کا پیرہن مذہبی ہے جب کہ بھگتی اور تصوف کے امتزاج کا دوسرا نمونہ میر اور غالب کی شاعری کا پیرہن غیر مذہبی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کبیر صوفی اور بھگت تھے اور میر اور غالب محض شاعر لیکن اس پیرہن کے باوجود کبیر سیکولر تھے۔ یہ مزاج رومی کا بھی ہے اور گرو نانک کا بھی اور اس کا ورثہ ٹیگور اور اقبال دونوں کے یہاں مل جائے گا۔''
> (ص۔6)

اس اقتباس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سردار جعفری کی غالب شناسی دیگر روایتی قسم کے نقادوں کی غالب شناسی سے کس قدر مختلف ہوگی اور یہ بھی ان کا تجزیاتی ذہن کس نوع کی وسعت اور عالمیت رکھتا ہے۔ گفتگو کا آغاز ہی ان جملوں سے ہوتا ہے:

> ''غالب یا شکسپیر کا ایک مصرع ہزار موقع پر ہزار معنی پیدا کر سکتا ہے۔ اس کے دامن میں اتنی وسعت ہوتی ہے کہ آنے والی زندگی کے ہنگاموں کو سمیٹ سکے۔ جب شاعر اپنے عہد پر حاوی ہونے کے ساتھ ساتھ لفظوں کے موتی آہنگ اور معنوی کیفیات سے بھی پوری طرح واقف ہو اور ان کو اس طرح چھیڑ سکے جیسے مطرب ساز کے تاروں کو چھیڑتا ہے۔ ادب کی تاریخ میں چند گنی چنی شخصیتیں اس معیار پر پوری اترتی ہیں۔ غالب ان میں سے ایک ہے۔'' (ص۔31۔130)

اس پورے تجزیے کا عنوان ہے ''تمنا کا دوسرا قدم'' جو محض غالب کے مصرعے سے مستعار نہیں ہے بلکہ انسانی پروازِ فکر اور جست وخیز کا معنی خیز اشاریہ بھی ہے اور یہ بھی کہ سردار غالب کی شاعری میں کس عنصر کو اہمیت دیتے ہیں اور کیا تلاش کرنا چاہتے ہیں۔ ابتدائی تعارف کے بعد غالب کا یہ

جملہ دہراتے ہیں۔ ''ستر برس کی عمر میں عوام سے نہیں خواص سے ستر ہزار آدمی گذر چکے ہیں۔'' اور یہ جملہ تو بطور خاص '' میں انسان نہیں ہوں انساں شناس ہوں۔'' یہ انسان شناسی کئی طرح کی ہے اس کی تخلیقی پرواز، فکر و عمل اور ساتھ ہی عیش کوشی بھی، نشاط پرور طبیعت بھی کہ غالب صرف فکر کے نہیں نشاط فکر کے بھی شاعر تھے جس میں سرور کائنات کے ساتھ ساتھ یک گونہ بے خودی کا بھی دخل ہے۔

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو ― اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

یہ بے خودی محض قطرۂ شراب سے نہیں آتی۔۔۔انسانی کارناموں، محبتوں اور محنتوں سے بھی آتی ہے۔ سردار جعفری نے غالب کی زندگی کے تین واقعات کو بہت اہمیت دی ہے بچپن کی یتیمی، دہلی کا قیام اور کلکتے کا سفر اور کہا۔۔۔''ان کا اثر اس کی شخصیت اور شاعری پر بڑا گہرا ہے'' (ص۔136)

یہ مشکلیں اور بے راہ روی غالب کی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ اسی سے درس ملتا ہے کہ حیات کا اور آدمیت کا بھی۔۔۔جب افلاس کا ڈیرا ہو اور روزی کی قلت تو بات صرف پیٹ کی نہیں ہوتی بلکہ زندگی کی ہوتی ہے اور ساتھ ہی مقصدِ زندگی کی بھی۔ بڑے بڑے کمزور ہو جاتے ہیں۔ غالب کا یہی وصف ہے کہ انھوں نے اسی کو اپنا استاد بنایا اور اسی کو رہبر اور مقصد۔۔۔یہاں یہ جملے دیکھیے:

> ''زندگی نے غالب کے ساتھ کچھ ایسا اچھا سلوک نہیں کیا اور ہمیشہ اس کی روح میں ریگزار ہی انڈیلتی رہی لیکن غالب کی روح نے زندگی کو لالہ زار بخشے۔ اس کی طبیعت کی یہ فیاضی اردو زبان و ادب کو مالا مال کر گئی۔'' (ص۔138)

اور پھر یہ ایک اہم سوال اٹھایا۔۔۔کہ غالب کے سامنے کوئی نظریۂ کائنات اور فلسفۂ حیات تھا یا نہیں۔۔۔روایتی تنقید عموماً پہلے شعر میں شعریت اور بعد میں معنویت دیکھتی ہے اور دونوں کا سرسری ذکر کر کے آگے بڑھ جاتی ہے شعر میں فلسفہ ہو یا نہ ہو زندگی کا نظریہ ہو یا نہ ہو اس سے سروکار نہیں رکھتی۔۔۔لیکن ترقی پسند تنقید عام طور پر اور سردار جعفری خاص طور پر شعر و ادب کو فکر

ونظر کے حوالے سے زیادہ جانچتے پرکھتے ہیں لیکن اس کے جمالیاتی پہلو کو نظر انداز بھی نہیں کرتے۔ جعفری نے ابتدا میں ہی اپنے نظریۂ جمال کی بات کہی ہے۔۔۔ اچھی بات یہ ہے جعفری نظریہ کے تعلق سے سوال کرتے ہیں اور پھر خود ہی جواب بھی دیتے ہیں کہ وہ (غالب) کسی خاص نظریے کا بانی نہیں ہے اس لیے اس کے یہاں منظم فکر اور پیام کی جستجو غلط ہوگی۔ اس کے باوجود غالب کی شاعری کو فکری اور فلسفیانہ مانتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس وقت تک شعر و ادب جدید فکر و فلسفہ سے زیادہ آشنا نہ تھے اس لیے ان میں قدیم تصور تصوف یا روایتی صوفیانہ رنگ ہی نظر آتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس روایت اور قدامت کو غالب نے کس طرح برتا اور پیش کیا۔ سردار جعفری کی اصل تلاش یہی ہے......اس تلاش کی ابتدا ان جملوں سے ہوتی ہے:

> ''وہ وحدت الوجود کا قائل تھا۔ اس نے اپنی فارسی مثنوی ''ابر گوہر بار'' میں کائنات کو ''آئینۂ آگہی'' کہا ہے جس کی فضا میں بکھرے ہوئے حسن حقیقت کے جلوے نگاہوں کو دعوت نظارہ دے رہے ہیں نہ محض یہ کہ انسان جس سمت رخ کرتا ہے اس سمت وہی وہ نظر آرہا ہے بلکہ جس رخ کو انسان چاروں طرف موڑ رہا ہے وہ خود اسی کا رخ ہے۔

جہانِ چیست ' آئینہ آگہی فضائے نظر گاہ ' وجہ اللہی
نہ ہر سو کہ روآوردسوئی اوست خوں آں راکہ آوردۂ روئی اوست (ص۔139)

ایک اور غزل میں یہ کہا۔

اصلِ شہود وشاہد و مشہود ایک ہے حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

غالب سوال بھی کرتے ہیں کہ ہر فکر مند و دانشمند شاعر کی شاعری سوال کے بطن سے آبشار بن کر پھوٹتی ہے۔

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

اور دیوان غالب کا پہلا شعر۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

جعفری شعر غالب اور فکر غالب کے حوالے سے سوال در سوال کرتے چلے جاتے ہیں کہ ان دنوں جعفری اشتراکی فکر سے آگے بڑھ کر انسانی فکر اور صوفیانہ وحدت کی تلاش میں سرگرداں تھے اور تلاشِ غالب میں تلاش سردار کے عناصر بھی موجود نظر آتے ہیں۔ دیکھئے غالب کے حوالے سے یہ سوال......

''اگر عالم پرتو ذات ہے تو وہ چیزیں جنھیں بدی، گناہ مصیبت، تکلیف اور درد وغم کہا جاتا ہے کہاں سے آتی ہیں۔ تضادات کہاں سے ابھرتے ہیں۔'' (ص۔141)

ان سوالوں میں جعفری کی اپنی فکر اور جستجو بھی نظر آتی ہے لیکن حوالہ غالب ہی ہیں لیکن یہ الزام بھی کہ غالب سوال تو اٹھاتے ہیں لیکن جواب تسلی بخش نہیں دیتے لیکن پھر وہ خود ہی کہتے ہیں ''خود صوفیا اور فلسفیوں سے یہ سوال نہیں سنبھل سکا تو ایک شاعر سے کیا توقع کی جاسکتی ہے۔'' پھر ایک شعر

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

اور یہ فکر انگیز نتیجہ..... یہاں غالب ہیگل کی جدلیت کے قریب پہنچ جاتا ہے اور اقبال کے ابتدائی نقوش قائم کرتا ہے۔'' (ص۔143)

پورا مضمون انھیں فکر وخیال کے اردگرد نظر آتا ہے۔ اچھی بات یہ ہے کہ جعفری تفکرات و تضادات کو مثبت انداز میں لیتے ہیں اور اس میں رجائی نگاہ تلاش کر لیتے ہیں انھیں یہ خیال بھی رہتا ہے کہ غالب شاعر پہلے ہیں باقی سب بعد میں یہ تخلیقی جملہ دیکھئے جو ایک شاعر کے قلم سے ہی نکل سکتا ہے۔

''غالب نے یقیناً اس عقیدے سے ایک بڑا رجائی نقطۂ نگاہ اختیار کیا ہے۔ جو اس کی شاعری میں خون بہار کی طرح دوڑ رہا ہے۔ رنج وغم تجدید طرب کی بنیادیں ہیں ان سے گریز کرنا موت اور کھیلنا زندگی کی دلیل ہے۔ خود موت زندگی کا مزہ بڑھا دیتی ہے اور نشاط کار کا حوصلہ بخشتی ہے۔

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا (ص۔146)

عام نقادوں نے اسے غالب کا فلسفۂ غم قرار دیا اور طرح طرح کی موشگافیاں کیں طرح طرح کے غم دیے لیکن سردار کی ترقی پسند نگاہیں غم میں نشاطِ غم کو تلاش کرتی ہیں انھیں اس غم میں دلآویزی اور نشاطیہ کیفیت کا اس قدر احساس ملتا ہے کہ وہ یہ کہہ بیٹھتے ہیں۔

''غالب کے غم اتنے دل آویز ہیں۔ ان میں جو نشاط کی کیفیت ہے وہ اردو کے کسی اور شاعر کے یہاں نہیں ملے گی۔ غالب کی شاعری میں غم و نشاط کو الگ الگ کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ وہ دراصل نشاط غم کا شاعر ہے۔ وہ بلاؤں سے دست و گریباں ہو کر سامانِ طرب حاصل کرتا ہے جیسے شراب کی تلخی گوارا کر کے سرور کی منزل حاصل کی جاتی ہے پھر وہ تلخی خود سرور بن جاتی ہے۔'' (ص۔147)

یہ جملے شاعری کے کرب اور شراب نوشی کے طرب کے بغیر ادا نہیں ہو سکے۔ جسے ایک فنکار ہی رقم کر سکتا ہے ثقہ قسم کے نقاد تلخی سے تو واقف ہوتے ہیں تلخی کے سرور سے سرور کا تعلق تو نشہ آور کیفیت سے ہوتا ہے اور نشہ جس قدر تخلیق میں ہوتا ہے تنقید میں نہیں۔ یہ ایک الگ قسم کی تنقید ہے اور اسی لیے الگ قسم کی غالب شناسی بھی۔۔۔۔ ذیل کے جملوں کو ملاحظہ کیجیے جو ایک تخلیق کار نقاد کے ہی قلم سے نکل سکتے ہیں:

''غالب نے اپنے احساسِ غم کا حسین وجمیل پیکر اپنے نو بہار ناز معشوق کے پیکر سے ناپ کر تراشا ہے۔ معشوق کے جسم میں رنگ و نور کا ایک طوفان ہے اور احساسِ غم میں خون کی موجیں بل کھا رہی ہیں اور شاعر ان دونوں سے بیک وقت کھیل رہا ہے اٹھلا رہا ہے اور ہنس ہنس کر بادۂ عیش و نشاط حاصل کر رہا ہے۔'' (ص۔147)

ایک جگہ اور :

''غالب کا ذوق اپنی لذت کوشی اور لذت اندوزی میں حدود و انتہا کا قائل ہی نہیں ہے۔ وہ حسن کو اس طرح جذب کر لینا چاہتا ہے کہ نگاہوں کو بھی اپنے اور معشوق کے درمیان حائل سمجھتا ہے اور انھیں کانٹے سمجھ کر آنکھوں سے نکال پھینکنا چاہتا ہے۔ اس عالم میں

ظاہر ہے کہ نگاہ کی کامیابی اور جلووں کی فراوانی بھی اسے سکون نہیں بخش سکتی اور وہ اپنے نامراد دل کی تسلی کے لیے تڑپتا رہ جاتا ہے، جب پینے پر آتا ہے تو خم کو ساغر بنا لینا چاہتا ہے۔" (ص۔151)

مثالیں اور بھی ہیں جن کو پیشہ ور نقاد لفاظی کہہ سکتا ہے (کہ تنقید ایک مخصوص ڈسپلن زبان اور اظہار چاہتی ہے۔) لیکن سردار جعفری کے یہاں محض لفاظی نہیں ہے۔ یہ ان کی مخصوص تخلیقی زبان ضرور ہے لیکن یہ زبان کہیں بھی حسن معنی اور سنجیدگی سے الگ نہیں ہے یہ ان کی جانچ پرکھ کا فنکارانہ طریقہ ہے لیکن اس طریق کار میں مفکرانہ وفلسفیانہ رویوں کی جو آمیزش ہے اور تہوں میں جو معنی کی تلاش ہے اسے کسی طرح نظر انداز نہیں کیا سکتا۔ اب یہ جملے بھی دیکھئے :

"شوق" غالب کا نہایت محبوب لفظ ہے اور اس کے خاندان کے دوسرے الفاظ تمنا، آرزو اور خواہش سے اس کی شاعری چھلک رہی ہے۔" (ص۔153)

ان الفاظ کے ذریعہ جعفری غالب کے اس شاعرانہ کمال اور فلسفیانہ جمال تک پہنچتے ہیں جہاں شاعر اپنے انتہائے شوق میں سفر حیات طے کرتا چلا جاتا ہے کہ اسی راہ میں منزل سے زیادہ منزل کی جستجو میں لذت محسوس کرنے لگتا ہے۔ لیکن یہ بھی کہ منزل کی آسودگی روح و دل کی موت بھی ہوا کرتی ہے۔ یہیں سے جعفری غالب کے ان جذبوں اور فلسفوں کو چھونے لگتے ہیں جہاں وقت، حرکت، عقل اور آدمیت و احترام آدمیت کے عناصر کارفرما نظر آتے ہیں اور سردار جعفری کے عقل پرست اور انسان دوست رویے کو نہ صرف آسودگی بلکہ غالب کے حوالے سے تشنگی کا احساس بیدار ہونے لگتا ہے اور وہ سفر در سفر غالب کی عظمت کے راستے پر چل پڑتے ہیں.... غالب کی عظمت دنیا حاصل کرنے میں نہیں بلکہ ایک نئے آفریدۂ گلشن کی تمنا ہے جس کے نشاطِ تصور نے غالب کو نغمہ سنجی پر مجبور کیا ہے۔ جعفری کہتے ہیں کہ اس نغمہ سنجی اور غزل گوئی میں باقاعدہ ایک تصور ہے۔ تصورِ انسان تصور حیات۔ اس لیے کہ غالب نے اپنے عہد کے انتشار اور بحران کو قریب سے دیکھ لیا تھا اور انھیں اندازہ ہوگیا تھا کہ مغل تہذیب کا کل چراغ گل ہونے والا ہے اور ایک نئی تہذیب جنم

لے رہی ہے حالانکہ غالب کو ماضی اور مغل تہذیب بے حد عزیز تھی لیکن وہ حقیقت آشنا بھی تھے اور بدلتے ہوئے سماج کے فطری عمل سے بھی واقف تھے اسی لیے وہ ارتقا کا ایک تصور بھی رکھتے تھے۔ جعفری لکھتے ہیں:

"اس کے نا آفریدہ گلشن کو صرف ذاتی خواہشات کا گلشن سمجھ لینا غالب کی توہین ہے۔ اس میں سماجی امکانات کا تصور اس لیے شامل ہے کہ غالب کے پاس سماجی ارتقا کا ایک معقول تصور تھا اور حسرتِ تعمیر اس کے سینے میں سب سے بڑا درد۔۔۔" (ص۔158)

گھر میں کیا تھا جو ترا غم اسے غارت کرتا وہ جو رکھتے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے

غالب کا کلکتہ کا سفر محض مقدمے کے سلسلے کا ایک عام سا سفر نہ تھا۔ انگریزوں کے ذریعہ لائی ہوئی ترقیوں اور تبدیلیوں نے غالب کی آنکھیں کھول دیں۔ سائنس اور صنعت نے ایک نئی دنیا آباد کر رکھی تھی۔ غالب مقدمہ تو ہار گئے لیکن فکر و نظر میں جیت ہوئی اور وہ تصور ارتقا جو اب تک مبہم سا تھا اسے مزید تقویت و حرارت ملی اور وہ غزل جو محض تصور و تخیل کی پرواز سمجھی جاتی تھی زندگی کی حقیقتوں اور انسانی ذہن کی کرشمہ سازیوں کے قریب تر آئی۔ وہ نئے صنعتی نظام کے قریب آئے۔ یہ قربت فطری ضرور تھی لیکن فکری طور پر بقول سردار جعفری :

"غالب کے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ اس نئے نظام کے سماجی رشتے کیا ہیں اور اس کی فطرت میں کس قسم کی غارت گری ہے لیکن اس کا ایک شعر ایسا ضرور ہے جو ایک لمحے کے لیے چونکا دیتا ہے۔

غارت گر ناموس نہ ہو گر ہوسِ زر کیوں شاہدِ گل باغ سے بازار میں آوے (ص۔160)

باغ سے بازار تک آنے کا یہ عمل معنی خیز ہے جو غالب کی غزلوں میں اکثر بڑے اشاراتی انداز میں ملتا ہے لیکن چونکہ غزل داخلی شاعری میں درک رکھتی ہے اس لیے وہ سارے انداز و آثار جو غالب کے یہاں فنکارانہ طور پر ملتے ہیں اس نے آگے چل کر اکبر اور اقبال کے یہاں کھل کر نظم

میں اپنی جگہ بنالی۔غزل میں داخلی اور خارجہ کیفیات کا ایک ایسا سنگم ہوتا ہے کہ درمیان میں خط کھینچ پانا مشکل ہوا کرتا ہے لیکن نظم کا تخلیقی عمل خارجی زیادہ ہوتا ہے اسی لیے نظم گو شعرا کے یہاں عہد اور آزاد عہد زیادہ بولتا ہے تاہم غالب کی غزلوں میں اس کے ابتدائی آثار دیکھے جا سکتے ہیں۔

تھوڑی دیر کے لیے سردار جعفری غالب کے ذاتی حالات کی طرف مڑ جاتے ہیں۔ چہار طرف سے ناکامی اور مایوسی گھیر لیتی ہے۔ ایک طرف دل کے حالات دوسری طرف دلّی کے حادثات، پھر بقول سردار جعفری:

''غالب کے لیے ماتم یک شہر آرزو کے سوا کچھ باتیں نہیں رہ گیا۔ان حالات میں وہ یہ کہنے پر مجبور تھا۔

نہ گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز میں ہوں اپنی شکست کی آواز (ص۔ 166)

لیکن پھر بھی جعفری کا ترقی پسند ذہن غالب کے غم میں آرزو و امکان کے راستے تلاش کر لیتا ہے خاص طور پر اس موڑ پر جہاں غالب حضرت انسان کی کرشمہ سازیوں پر خوش ہوتے ہیں اور حیرت میں بھی پڑتے ہیں۔ غالب کا خیال ہے کہ خدا کی ذات سے تو صرف ایمان کا ایک شعلہ روشن ہے تہذیب و تمدن اور کائنات کی رونق تو انسان کے دم سے ہے۔

آتش افروزئی یک شعلۂ ایماں تجھ سے چشمک آرائی صد شہر چراغاں مجھ سے

یہ احترام آدمیت اور انسانی عظمت غالب کی شاعری کا وہ جوہر ہے جو اسے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بھی مایوس نہیں ہونے دیتا۔اسی لیے وہ مشکل حالات میں بھی مسکراتا رہتا ہے۔ خدا کی خدائی پر اور انسان کی تباہی پر بھی لیکن ساتھ ہی وہ امکانی روش اور انسانی خلش سے بھی واقف ہے۔ وہ انسانی توفیق سے بھی آشنا ہے اور اس کے تصور و تخیل سے بھی کہ انسان کے پاس خواب اور تخیل کی اتنی بڑی طاقت ہے جس سے وہ نئی سے نئی اور بڑی سے بڑی دنیا تعمیر کرنے لگتا ہے۔ شاعری کے لیے تو یہ دونوں ہی عناصر ناگزیر ہیں۔ کبھی کبھی تو یہ عناصر عشق کی منزلوں کو چھونے لگتے ہیں۔ یہ خیالات دیکھیے :

''غالب کی یہ ساری خصوصیات مل کر اس کے تصورِ عشق کو ایک ایسا روپ دیتی ہیں جس سے اردو پہلے نا آشنا تھی۔ حسن کی بے پناہ کشش کے سامنے جس میں افلاطونیت کم ہے اور جسمانیت زیادہ، انتہائی سپردگی اور نیاز مندی کے باوجود غالب کا عشق خوددار اور سر بلند ہے۔ زندگی کے لیے اگر یہ اصول ہے کہ جو نالہ ہونٹوں تک نہیں آیا وہ سینے کا داغ بن گیا۔ اس لیے ضبطِ غم کا حوصلہ تنگ ہونا چاہیے اور غصے کی شدت زیادہ تو عشق کے لیے یہ اصول کہ

عجز و نیاز سے تو نہ آیا وہ راہ پر　　دامن کو اس کے آج حریفانہ کھینچیے

اور غزل کی اشاریت کا تقاضہ یہ ہے کہ صرف معشوق کو نہیں بلکہ ہر آدرش کو چاہیے وہ نئی زندگی کی تمنا ہی کیوں نہ ہو اسی طرح دامن کھینچ کر لایا جا سکتا ہے۔''

سردار جعفری کا کمالِ نقد یہ ہے کہ وہ مکمل غالب کو پورے سیاق و سباق کے ساتھ سماجی اور تہذیبی پس منظر میں پیش کرتے ہیں اور اس کی ذات انانیت و خود داری، اس کے غم اور الم کو۔ اس کے حالات و حادثات کو اس عہد کے حالات و حادثات، ذاتی اضطراب کو اس عہد کے اضطراب سے جوڑ کر دیکھتے ہیں۔ اضطراب، محسوسات کا ایک فطری عمل ہوا کرتا ہے لیکن اس کو ایک آدرش کا روپ دے دینا ایک فکری عمل ہوتا ہے جو ہر اک کے بس کی بات نہیں۔ یہی وہ عمل ہے جہاں سے غالب نہ صرف سب سے الگ ہوتا ہے بلکہ عظیم ہوتا ہے۔ مضمون کے آخر میں جعفری یہ نتیجہ نکالتے ہیں :

''غالب کی عظمت صرف اس میں نہیں ہے کہ اس نے اپنے عہد کے باطنی اضطراب کو سمیٹ لیا بلکہ اس میں کہ اس نے نیا اضطراب پیدا کیا۔ اس کی شاعری اپنے عہد کے شکنجوں کو توڑ دیتی ہے اور ماضی اور مستقبل کی وسعتوں میں پھیل جاتی ہے۔ اس کے یہاں ایک عالم گیر اور آفاقی شاعر کا لہجہ پیدا ہوا ہے اور وہ زندگی کے ہر لمحے کا شاعر بن گیا ہے۔''

یہی نہیں ترقی پسند جعفری کی تان اس جملے پر ٹوٹتی ہے :

''اس شاعری سے لطف اندوز ہونے کے لیے صرف لفظی معنوں سے واقف ہونا کافی

نہیں ہے۔ شعروں کو بار بار پڑھنا ضروری ہے۔۔۔ جنھوں نے اپنے اندر شوق کی واماندگی کو سجا رکھا ہے اور میخانہ مکمل انسانیت اور مکمل آزادی کی منزل بن کر سامنے آئے گا۔ پھر دیوان غالب کے ہر ورق پر اس کے تخیل کی مخلوق انگڑائیاں لینے لگے گی۔ اس سراپا ناز محبوب کی آنکھوں سے مسکرائیں گے اور دنیا زیادہ خوبصورت ہو جائے گی۔ اور انسان زیادہ قابل احترام۔" (ص۔174)

جعفری کے نزدیک غالب کی شاعری اس لیے زیادہ عظیم ہے کہ وہ صرف اردو شاعری کو ہی نہیں عظیم بناتی بلکہ دنیا کو خوبصورت اور انسان کو قابل احترام بھی بناتی ہے۔ وہ مکمل انسانیت اور مکمل آزادی بن کر سامنے آتی ہے۔ بحث ہو سکتی ہے کہ غالب کی مشکل اور نازک غزلیہ شاعری میں ایسے عناصر کی تلاش جعفری کی اپنی اختراع ہو سکتی ہے لیکن اچھی بات یہی ہے کہ جعفری کسی موڑ اور مقام پر مثال اور منطق کے بغیر کوئی گفتگو نہیں کرتے اور غالب کی عظیم شاعری کو انسان، انسانی معاشرہ اس کے زوال و کمال، انتشار اور بحران کے درمیان سے نکال کر اس طرح کندن بناتے ہیں جیسے آگ میں جل کر سونا کندن ہو جاتا ہے۔ یہ ایک بڑے اسکالر کا بڑے شاعر کے تئیں خراج بھی ہو سکتا ہے اور تنقید کا تخلیقی انداز بھی چنانچہ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ غالب شناسی کا یہ ایک نیا زاویہ ہے جس نے ڈانڈے مجنوں، احتشام حسین، ممتاز حسین، محمد حسن تک پھیلے ہوئے ہیں اور اس سے الگ بھی ہیں۔

دیوانِ غالب کے اس بسیط و بلیغ مقدمے کے علاوہ سردار جعفری نے غالب پر دو ایک اور بھی کام کیے ہیں۔ 1997 میں جب غالب کا دوسو سالہ جشن پیدائش منایا گیا تو اس وقت سردار جعفری نے غالب کی فارسی مثنوی "چراغ دیر" کا اردو میں ترجمہ کیا۔ جسے پٹنہ سے جابر حسین نے "غالب کا سومنات خیال" کے عنوان سے شائع کیا۔ جس میں سردار جعفری کا ایک مقدمہ بھی شامل ہے.... جس کا آغاز ان جملوں سے ہوتا ہے:

"شاعری آرائش کاکل بھی اور اندیشہ ہائے دور دراز بھی۔ آرائش کاکل جمالیاتی عمل ہے

اور اندیشۂ ہائے دور دراز ایک فلسفیانہ تجسس۔"

''چراغ دیر'' کے تعلق سے سردار جعفری کی نکتہ سنجی ملاحظہ کیجیے:

''اگر آرائش کو رادھا اور اندیشے کو گیتا فرض کر لیا جائے تو کرشن کی عظمت کا راز کچھ کچھ سمجھ میں آسکتا ہے۔ ہمارے شعراء میں اقبال کے پاس گیتا ہے لیکن رادھا نہیں ہے اور جگر، فیض، مجاز کے پاس رادھا ہے گیتا نہیں ہے۔ غالب عظیم تر اس لیے ہے کہ اس کے پاس رادھا بھی ہے اور گیتا بھی۔'' (غالب کا سومنات خیال۔ص۔ 17)

یہ جعفری کا اپنا ایک مخصوص انداز نقد ہے کہ تخلیقی پیرایے میں تنقید کی راہیں تلاش کرتے ہیں اور مشکل سے مشکل فلسفہ کو پانی کرتے چلے جاتے ہیں۔۔۔۔

''چراغ دیر'' فارسی زبان کی مثنوی ہے اس لیے فارسی شاعری وشعراء کا ذکر گزیر ہے اور یہ بھی کہ کن شعراء سے غالب نے کسب فیض کیا ہے اور پھر اپنی فارسی شاعری میں انھیں رد بھی کیا ہے کہ ہر بڑا شاعر یہی کرتا ہے جسے انکار کہہ سکتے ہیں اور انحراف بھی کہ بت تراشی کا پہلا عمل بت شکنی ہوا کرتا ہے۔ ان امور پر گفتگو کرتے ہوئے وہ سومنات کے مندر کی طرف آتے ہیں۔ تعارف و تاریخ سامنے آتی ہے۔ میر نے سومنات کو شمع حرم کے متوازی کھڑا کیا۔ غالب نے اپنی شاعری کا سومنات خیال کہہ کر اس کو صوفیانہ فکر و درجہ تو دیا لیکن اس سے باہر بھی نکالا اور ایک نیا وقار دیا۔ جعفری کا کہنا ہے کہ اس میں عقیدے کا دخل نہیں ہے بلکہ یہ ایک غیر مذہبی فکر کی کارفرمائی ہے۔ یہ سوال بھی اٹھایا کہ :

''یہ بات بہت دلچسپ اور فکر انگیز ہے کہ غالب نے اپنی شاعری کو سومناتِ خیال کیوں کہا۔ اس کی کسی تحریر سے اس بات کا پتہ نہیں چلتا۔'' (ص۔22)

اور پھر وہ یہ بھی کہتے ہیں:

''میرے خیال میں اس کی جستجو کہ غالب نے اپنی شاعری کو سومناتِ خیال کیوں کہا ہے اس کے جمالیاتی شعور اور احساس میں کرنی چاہیے۔ غالب کی شاعری میں شاعرانہ پیکروں کی جو فراوانی ہے وہ کسی اور شاعر کے یہاں نہیں ہے۔ اس نے غیر مرئی خیالات

کو اور مبہم فکر و احساس کو بھی جسمانی پیکروں کی شکل میں بیان کیا ہے۔'' (ص۔22)

اس کی تائید اور تصدیق کے لیے وہ اشعار بھی پیش کرتے ہیں جو اس بات کی دلیل ہے کہ جعفری فکر و خیال کی کوئی گفتگو کوئی پہلو محض خارجی انداز سے اور تنقید کے رعب علم سے نہیں کرتے بلکہ خود غالب کی شاعرانہ تجسیم و تحلیل کو کھنگال کر اشعار کی تہوں اور جہتوں سے برآمد کرتے ہیں۔ سومنات کا خیال اور امیجری کے سلسلے میں ان کا خیال بڑی حد تک درست ہے کہ اپنے آپ کو فارسی شعراء سے متمیز کرنے کے لیے ایرانی استعارات سے گزیر کرتے ہیں اور ہند کا پیکر تلاش کرتے ہوئے معروف سومنات تک پہنچتے ہیں کہ اس سے بہتر انھیں کوئی دوسرا استعارہ نہ مل سکا۔ اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے بقول سردار جعفری۔۔۔۔''غالب کو جتنی محبت ایرانی فارسی شاعری سے تھی اتنی ہی محبت اپنے وطن ہندوستان سے بھی تھی۔ ہم اس کو والہانہ محبت کہہ سکتے ہیں۔''

مثنوی ''چراغ دیر'' اسی والہانہ محبت کی عکاسی ہے۔ ایسا جعفری کا خیال ہے جو بڑی حد تک درست ہے اور یہ بھی کہ یہ مثنوی بنارس کے دیر پر ضرور ہے لیکن حقیقتاً ہندوستان پر ہے کہ بنارس ہندوستانی و ہندو تاریخ و تہذیب کی ایک خوبصورت علامت ہے۔

اپنے مقدمے کے سلسلے میں غالب دہلی سے کلکتہ جاتے ہوئے بنارس رکے تھے۔ بنارس تک پہنچتے پہنچتے غالب سفر کی تکان اور مشکلات سے خستہ ہو چکے تھے۔ ایسی صورت میں بنارس نے دامنِ دل کھینچ لیا۔ جعفری لکھتے ہیں:

> ''بنارس نے غالب کے لیے جسمانی سکون اور روحانی آسودگی کا سامان فراہم کیا۔ جس پر مثنوی ''چراغ دیر'' شاہد ہے۔ بنارس کو عبادت خانہ ناقوسیاں اور کعبۂ ہندوستان اور بہشت خرم و فردوس معمور ہی نہیں کہا بلکہ وہاں کے پری پیکروں کو بتان بت پرست و برہمن سوز کہہ کر غالب نے اپنے ذوقِ جمال کا قصیدہ نظم کیا ہے۔ یہ سرور انگیز مثنوی ایک زندہ جاوید شاہکار کا درجہ رکھتی ہے۔'' (ص۔29)

اور مضمون اس شعر پر ختم ہوتا ہے۔ غالب نے تمام عمر بنارس کو یاد کیا۔

کاش کان بت کاشی در پذیردم غالب		بندہ تو ام گویم گویدم زنار آری

کاش وہ بت کاشی مجھے ایک بار مل جائے اور اس سے کہوں کہ میں تیرا بندہ ہوں اور وہ بڑے ناز سے جواب دے ہاں مجھے معلوم ہے۔'' (ص۔31)

اس مقدمے میں مثنوی کی تعریف ہی تعریف ہے وجہِ تخلیق بھی ہے لیکن اشعار کے ذریعہ اس جمالیاتی شعور کی تلاش نظر نہیں جس کا ذکر وہ ابتدا میں کر چکے ایسا شاید اس لیے کہ آئندہ اوراق میں انھوں نے مثنوی کے ایک ایک شعر کا اردو میں ترجمہ کیا ہے اسے سمجھنے اور سمجھانے کی غیر معمولی کوشش کی ہے۔ دو تین اشعار کی وضاحت پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

سخن را نازش مینو قماشے		زگلبانگ ستائش ہائے کاشے

جب کاشی کی تعریف وتوصیف میں نغمہ بن کر بلند ہوتا ہے تو سخن اپنی فردوس مزاجی پر ناز کرنے لگتا ہے۔

بنارس را کسے گفتہ کہ چینِ است		ہنوز از گنگ چینش بر جبین است

کسی نے حسن کی تعریف میں بنارس کو چین کہہ دیا۔ (یہ سن کر بنارس کو اپنی توہین محسوس ہوئی اور اس لیے) اب تک بہتی ہوئی گنگا کی شکل میں اس ماتھے پر شکن ہے۔

زہے آسودگی بخش روانہا		کہ داغ چشم می شویدز جانہا

کیا کہنا اس شہر کو جو روحوں کو آسودگی اور سکون بخشتا ہے اور جانوں سے آنکھوں کے داغ دھو دیتا ہے (اب روحیں پیکر محسوس میں نہیں آتیں اور اس لیے نگاہوں کے داغ سے پاک ہو جاتی ہیں۔) غالب سردار جعفری کے ذہن پر عمر آخر تک سوار رہے۔ اپنی زندگی کی آخری تقریر غالب پر کی جو انجمن اسلام بمبئی کے ایک پروگرام...."غالب کی کہانی سردار جعفری کی زبانی'' میں کی گئی تھی۔ یہ تقریر رسالہ نوائے ادب میں شائع ہوئی جس کے آخر میں لکھا ہے مندرجۂ بالا تقریر مرحوم سردار جعفری کی آخری تقریر تھی۔ اس تقریر میں سابقہ تحریروں کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ چند اہم جملے پیش کر کے گفتگو تمام کرتا ہوں :

''اقبال کے فلسفہ خودی پر غالب کے فلسفۂ زندگی کا بڑا گہرا عکس ہے۔ غالب نے اسے فلسفیانہ طور پر ادا نہیں کیا ہے بلکہ شاعرانہ سطح پر۔''

کوئی شاعر ہمیں غالب کے قریب کھڑا نظر نہیں آتا کہ جس کے یہاں وسعت اتنی زیادہ ہو اور 12-10 سو شعر یا 14 سو شعر 15 سو شعر دیوان غالب جو مرجہ دیوانِ غالب ہے اس میں یہ ساری کائنات موجود ہے۔''

''ہمیں غالب کی شاعری میں بھی پست اور بالا خشک تر اشعار ملیں گے جو بے شمار ہیں اور ہماری زندگی میں کام کرتے ہیں۔ اہتمامی کا، اداسی کی گھڑیوں سے باہر نکالنے میں مدد دیتے ہیں۔ نشاط و مسرت پیدا کرنے میں مدد دیتے ہیں۔''

''غالب نے نئی زندگی کو دیکھا مستقبل کے ہندوستان کا تصور ان کے ذہن میں واضح ہوگیا۔ مشین کی عظمت کا انھوں نے اعتراف کیا۔ ان لوگوں نے ہمیں سوچنے اور سمجھنے کا موقع دیا۔'' (نوائے ادب، 1/ اکتوبر تا دسمبر 2000)

یوں تو جعفری کی گفتگو، انٹرویوں، دیباچوں اور مقدموں میں بھی غالب کا ذکر آتا ہے اور بار ہا آتا ہے۔ گیان پیٹھ ایوارڈ کے موقع پر کی گئی تقریر میں بھی انھوں نے غالب کی عظمت کا اظہار کیا اس لیے کہ غالب صرف ایک شاعر نہ تھے ایک عہد تھے، ایک تہذیب تھے۔ ترقی اور تبدیلی کی علامت تھے۔

غالب سے متعلق ان تحریروں اور تقریروں میں سردار جعفری کا اندازِ نظر خالص معروضی اور حقیقی ہے جسے وہ سماج، معاشرہ، تاریخ سے الگ کر کے نہیں دیکھتے اور ترقی پسند تنقید کا یہ شیوہ بھی رہا ہے لیکن جعفری کا اسلوب نقد جداگانہ ہے جہاں ایک عالم و مفکر تو بولتا ہی ہے اس سے زیادہ شاعر اور فنکار بولتا ہے اس سے سردار جعفری کی تنقید کو ایک الگ شناخت ملتی ہے اور غالب شناسی کا ایک نیا زاویہ بھی۔ سردار کی یہ تحریریں غالب شناسی میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

✿✿✿

پروفیسر قاضی جمال حسین

حالی اور نظمِ جدید

حالی کی نظموں کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ یہ تین، نئی شعریات کے تحت ترتیب دیا گیا ہے۔ ایسی شعریات جو روایت سے انحراف کا نقطۂ آغاز ہے۔ ان نظموں کے خیالات، مضامین اور پیرائے اظہار نئے اور کسی قدر اجنبی ہیں۔ ان نظموں میں نہ تو ہجر وصال کے قصے ہیں نہ مزے مزے کی حکایتیں۔ خیال ہوتا ہے کہ شاعری کا مرکز ثقل اور محور ہی تبدیل ہوگیا ہے۔ شاعری کا یہ نیا رنگ، معاشرتی نظام میں تبدیلی کا اشاریہ تھا۔ حالی نے کسے طے شدہ منصوبے کے تحت قوم کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ سیاست کی بساط پر مشرق کی شکست ایک تاریخی حقیقت ہے۔ انھیں محسوس ہو کہ برسر اقتدار طبقے کی معاشرت سے ہم آہنگی کے بغیر جسم و جان کا رشتہ قائم رکھنا بھی شاید دشوار ہوگا۔ ترجیحات کا پورا گوشوارہ ہی تبدیل ہو چکا ہے۔ علم اور تہذیب کا وہ تصور اب باقی نہیں رہا، جواب تک مشرق کا امتیاز تھا۔ مبالغہ آرائی، زبان و بیان کے کرشمے، تخیل کی پروازی، صنائع کا حسن، سب بے وقت کی راگنی بن چکے ہیں۔ حقیقت کے لیے تھوڑے پرانے نظام فکر کو بے دخل کردیا ہے۔ حقیقت وہ ہے جو ہمارے حسّی ادراک کی گرفت میں ہے۔ جو ہمارے روزمرہ کے تجربے میں ہے۔ حقیقت کے اس نئے تصور نے مشرقی شعریات کا نظام تہ وبالا کردیا۔ حالی نے اصرار کیا کہ شعر کو لفظ اور معنیٰ پر دو ر اعتبار سے نیچرل ہونا چاہیے۔ شعر میں وہی باتیں بیان کی جائیں جو عام طور پر دنیا میں ہوتی ہیں۔ یا کم از کم جیسی ہونی چاہیے۔ حالی کے دیوان میں ''شعر کی طرف خطاب'' کے عنوان سے چند اشعار درج ہیں جن سے اس نئی شعریات کی بعض صفات پر روشنی پڑتی ہے۔

اے شعر دلفریب نہ ہو تو تو غم نہیں　　پر تجھ پہ حیف ہے جو نہ ہو دل گداز تو
صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام　　ہاں سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تو

جوہر ہے راستی کا اگر تیری ذات میں　　تحسین روزگار سے ہے بے نیاز تو
وہ دن گئے کہ جھوٹ تھا ایمان شاعری　　قبلہ ہو اب ادھر تو نہ کیجیو نماز تو
کرنی ہے فتح گر نئی دنیا تو لے نکل　　بیروں کا ساتھ چھوڑ کے اپنا جہاز تو

دلفریبی اور خیال آرائی کے بجائے، دلسوزی راست بازی اور نئی دنیا سے ہم آہنگی اس نئی شعریات کا ایک مبہم خاکہ ہے۔ اگر زندہ رہنا ہے تو روایتی بیڑوں کو چھوڑ کر جہاز کی سواری ناگزیر ہے۔ شاعری کے اصولوں میں سطح پر رونما ہونے والی ہر تبدیلی، تصورِ حیات میں تبدیلی کا ادنیٰ مظہر ہے۔ جب مادّی دنیا ہی اصل حقیقت ہے اور یہاں کی کامیابی سب سے بڑی سچائی بن جائے تو شاعری کے اصولوں کا تبدیل ہونا فطری بات ہے۔ جس نظامِ فکر میں مادّہ خیال پر مقدم ہو اور خیال مادّے کا تابع ہو جائے تو پھر شعر کے مضامین غیب سے نہیں آتے اور نوائے سروش کی کچھ حقیقت باقی نہیں رہتی۔ برطانوی اقتدار کے بعد تصورِ کائنات کی یہ تبدیلی تہذیبِ نو کا شناخت نامہ ہے۔ حالی مقدمہ شعر و شاعری میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

> ''قوت متخیلہ کوئی شے بغیر مادے نے نہیں پیدا کرسکتی۔ بلکہ جو مصالحہ اس کو خارج سے ملتا ہے اس میں وہ اپنا تصرف کر کے ایک نئی شکل تراش لیتی ہے۔ جتنے بڑے بڑے نامور شاعر دنیا میں گزرے ہیں وہ کائنات یا فطرت انسانی کے علاوہ مطالعے میں ضرور مستغرق رہے ہیں۔'' (مقدمہ شعر و شاعری، ص 44-43)

شعر و ادب کے مختلف نظریات کا اگر تجزیہ کیا جائے تو اصول یہ برآمد ہوتا ہے کہ مادّہ اور خیال میں تقدم اور برتری کے تصور میں تبدیلی کے ساتھ ہی شعریات کا نظام بھی تبدیل ہو جاتا ہے۔ نظم جدید کی تحریک میں شعریات کا نیا تصور دراصل حقیقت کے تصور میں اس بنیادی تبدیلی کا نتیجہ ہے۔ حالی کی مقبول ترین نظم ''مدوجزر اسلام'' جب 1879 میں پہلی بار شائع ہوئی تو لوگوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ترقی محفل کے لیے اس نظم کے کئی کئی بند واعظوں کو ازبر تھے، حالی نے اس نظم پر ایک دیباچہ بھی لکھا تھا۔ اس کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

> ''زمانے کا نیا ٹھاٹ دیکھ کر پرانی شاعری سے دل سیر ہو گیا اور جھوٹے ڈھکوسلے باندھنے

سے شرم آنے لگی.... قوم کی حالت تباہ ہے، عزیز ذلیل ہو گئے ہیں۔ علم کا خاتمہ ہو چکا ہے... افلاس کی گھر گھر پکار ہے۔ پیٹ کی چاروں طرف دہائی ہے۔ اخلاق بالکل بگڑ گئے ہیں............... ایسے میں جس سے جو کچھ بن آئے سو بہتر ہے۔ ہر چند کہ لوگ بہت لکھ چکے ہیں اور لکھ رہے ہیں۔ مگر نظم جو کہ سب کو بالطبع مرغوب ہے اور خاص کر عرب کا ترکہ اور مسلمانوں کا موروثی حصہ ہے، قوم کے بیدار کرنے کے لیے اب تک کسی نے نہیں لکھی..... برسوں کی بجھی ہوئی طبیعت میں ایک ولولہ پیدا ہوا اور باسی کڑھی میں ایک ابال آیا...... ایک مسدس کی بیناد ڈالی۔'' (دیباچہ 'مسدس حالی' ص، 7-6)

زمانے کے اسی نئے ٹھاٹ نے حالی کی قلب ماہیت کردی، انھیں اپنے شعری سرمایہ سے شرم آنے لگی اس نئے ٹھاٹ کے سامنے مکمل سپردگی اور احساسِ کمتری یہ تصویر دیدنی ہے۔

وہ شعر اور قصائد کا ناپاک دفتر عفونت میں سنڈاس سے جو ہے بدتر
زمیں جس سے ہے زلزلے میں برابر ملک جس سے شرماتے ہیں آسماں پر
ہوا علم دیں جس سے تاراج سارا
وہ علموں میں علمِ ادب ہے ہمارا

برا شعر کہنے کی گر کچھ سزا ہے عبث جھوٹ بکنا اگر ناروا ہے
تو وہ محکمہ جس کا قاضی خدا ہے مقرر جہاں نیک و بد کی جزا ہے
گنہگار واں چھوٹ جائیں گے سارے
جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے

جو سقے نہ ہوں جی سے جائیں گزر سب ہو میلا جہاں گم ہوں دھوبی اگر سب
بنے دم پہ گر شہر چھوڑیں نفر سب جو ٹھہر جائیں مہتر تو گندے ہوں گھر سب
پہ کر جائیں ہجرت جو شاعر ہمارے
کہیں مل کے خس کم جہاں پاک سارے

اپنے شعری سرمایہ کے تئیں منفی رویے کے اس Climex کا آغاز انجمن پنجاب کے مشاعروں

سے ہوتا ہے۔ ان مشاعروں کی ابتدا حکومت کی ایما پر ہوئی۔ جی ڈبلو لائسنر (پرنسپل گورمنٹ کالج لاہور) اور کرنل ہالرائیڈ (ڈائریکٹر سررشتہ تعلیم) نے پنڈت بن پھول کی نگرانی میں 'انجمن اشاعت مطالب مفیدہ' قائم کی۔ اس انجمن کے ایک جلسے میں محمد حسین آزاد نے ''خیالات درباب نظم وکلام موزوں'' کے عنوان سے ایک لکچر دیا اور اپنی نظم ''شب قدر'' سنائی۔ اس کے بعد کرنل ہالرائیڈ نے یہ تجویز پیش کی۔

> ''جس طرح پر شہر میں عموماً شاعری ہوا کرتی ہے۔ آپ بھی ایک مشاعرہ مقرر کریں۔ مگر اتنا ہو کہ یہاں بجائے مصرعہ طرح' کوئی مضمون خاص ملا کرے کہ اس پر سب لوگ طبع آزمائی کر کے لایا کریں اور جلسۂ عام میں سنایا کریں۔ جو تجویز میں نے آپ کے روبرو پیش کی ہے اگر وہ خاطر خواہ عمل میں آئے تو سن 1874 ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ یادر ہے گا اور لوگ کہیں گے کہ نظم اردو کی طرز قدیم کن کن اشخاص کی سعی و کوشش سے چاہِ تنزل سے نکل کر اوجِ ترقی کو پہونچی۔ میری یہ رائے ہے کہ مہینہ بھر کے بعد جلسہ ہوا کرے۔ اور اب کہ دفع جو جلسہ ہو سب اہل سخن ایک نظم برسات کی تعریف میں لکھیں۔'' (بحوالہ اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ از ڈاکٹر منظر اعظمی، ص 133)

ہالرائیڈ کی اس تجویز میں سب سے اہم نکتہ یہ تھا کہ مشاعرے میں مصرعہ طرح کے بجائے نظم کا عنوان دیا جائے۔ مصرعہ طرح کے بجائے نظم کا عنوان دیے جانے میں بہ ظاہر کوئی قباحت نہ تھی لیکن در پردہ حکمت یہ تھی کہ مصرعہ طرح میں شاعر ہیئت یعنی بحر و قافیہ کا پابند ہوتا ہے اور خیالات آزاد ہوتے ہیں جبکہ نظم کا عنوان طے ہونے کی صورت میں ہیئت کے انتخاب کی آزادی تھی لیکن خیالات پابہ زنجیر تھے کہ جو کچھ کہنا ہے وہ دیے گئے عنوان سے ہی متعلق ہوگا۔ یہ ایک بڑی تبدیلی تھی جس کے دوررس اثرات مرتب ہوئے۔

محمد حسن آزاد کے لکچر اور مثنوی شب قدر پر اظہار خیال کرتے ہوئے ہالرائیڈ نے یہ بات بھی کہی کہ:

> ''اس وقت مولوی حسین آزاد نے جو مضمون پڑھا اور رات کی حالت پر شعر سنائے وہ بہت تعریف کے قابل ہیں۔ یہ نظم ایک عمدہ نمونہ اس طرز کا ہے جس کا رواج مطلوب ہے۔''

اس بیان سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ نظم گوئی کا یہ انداز حکومت وقت کی منشا کے مطابق اختیار.

کیا گیا تھا۔ محمد حسین آزاد نے اپنے لکچر میں جن باتوں پر زور دیا تھا اور جس دل سوزی سے شاعری کے نئے اصولوں کو وقت کی ضرورت بتا کر، اہل وطن کو مخاطب کیا تھا وہ پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لکچر میں آزاد کا مشہور زمانہ بیان بھی ہے کہ ''صندوقوں کی کنجی ہمارے ہم وطن انگریزی دانوں کے پاس ہے'' یہ اقتباس سنئے:

''اے میرے اہل وطن! اس سے یہ نہ سمجھنا کہ میں تمہاری نظم کو سامان آرائش سے مفلس کہتا ہوں۔ نہیں اس نے اپنے بزرگوں سے لمبے لمبے خلعت اور بھاری بھاری زیور میراث پائے۔ مگر کیا کرے کہ خلعت پرانے ہوگئے اور زیوروں کو وقت نے بے رواج کردیا۔ تمہارے بزرگ اور تم ہمیشہ سے نئے مضامین اور نئے انداز کے موجد رہے۔ مگر نئے انداز کے خلعت اور زیور جو آج کے مناسب حال ہیں وہ انگریزی صندوقوں میں بند ہیں کہ ہمارے پہلو میں دھرے ہیں اور ہمیں خبر نہیں۔ ہاں صندوقوں کی کنجی ہمارے ہم وطن انگریزی دانوں کے پاس ہے۔'' (دیباچہ نظم آزاد)

انجمن پنجاب کے انھیں جلسوں میں حالی نے چار مثنویاں سنائیں۔ انجمن کا دوسرا جلسہ 30 مئی 1874 کو منعقد ہوا اور حالی نے ہالرائیڈ کی تجویز کے مطابق برسات کے موضوع پر مثنوی ''برکھارت'' پیش کی۔ مثنوی کا انداز یہ ہے کہ حالی دیر تک ایک منظر اور ایک کیفیت پر رکتے ہیں۔ جب تک منظر کی تصویر مختلف زاویوں سے مکمل نہیں کرلیتے اور مطلوبہ کیفیت پیدا نہیں ہوجاتی۔۔ جزئیات کے بیان سے تصویر میں رنگ بھرتے رہتے ہیں۔ مثنوی سادگی کی بے پناہ شدت کے بعد موسم کا رنگ بدلتی ہے اور بارش کے آثار پیدا ہوتے ہیں۔

بارش کا بج رہا ہے ڈنکا — اک شور ہے آسماں پہ برپا
ہیں رنگ برنگ کے رسالے — گورے ہیں کہیں' کہیں ہیں کالے
ہے چرخ پر چھاؤنی سی چھاتی — ایک آتی ہے فوج ایک جاتی
جاتے ہیں مہم پہ کوئی جانے — ہمراہ ہیں لاکھوں توپ خانے

توپوں کی جب ہے باڑ چلتی چھاتی ہے زمین کی دہلتی

معلوم ہوتا ہے انگریزی فوج کے دستے جنگی سازوسامان سے لیس، دلوں کو دہلا دینے والی ہیبت کے ساتھ آسمان پر گشت کر رہے ہیں۔ بادلوں کے لیے لائی گئی یہ تشبیہات حالی کے لاشعوری قوت کا بے ساختہ اظہار معلوم ہوتی ہیں۔

برسات کے موسم کی دوسری تصویر دیکھیے، حالی نے سہل ممتنع کے انداز میں کمال فنکاری سے تصویر میں جان ڈال دی ہے۔ حالی نے منظر کو بیان کرنے کے لیے ایسی جزیات کا انتخاب کیا ہے کہ تصویر میں زندگی کی حرارت اور چہل پہل کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ فن پر ایسی گرفت حالی کے معاصرین میں، خال خال ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔ برسات کا ایک دوسرا منظر بھی ملاحظہ ہو۔

کھم باغوں میں جابجا گڑے ہیں جھولے ہیں کہ سو بہ سو پڑے ہیں

کچھ لڑکیاں بالیاں ہیں کم سن جن کے ہیں یہ کھیل کود کے دن

ہیں جھول رہی خوشی سے ساری اور جھول رہی ہیں باری باری

جب گیت ہیں ساری مل کے گاتی جنگل کو ہیں سر پہ وہ اٹھاتی

ایک سب کو کھڑی جھلا رہی ہے ایک گرنے سے خوف کھا رہی ہے

ایک جھولے سے گری ہے جا کر سب ہنستی ہیں قہقہے لگا کر

حالی کے پیرایہ بیان سے نوعمر لڑکیوں کے قہقہے صاف سنائی دینے لگتے ہیں۔ حالی کی دوسری مثنوی ''نشاط امید'' انجمن کے چوتھے جلسے میں پڑھی گئی۔ یہ جلسہ 3 اگست 1974 کو منعقد ہوا۔ اس مشاعرے کا موضوع امید تھا۔ حالی نے اس مثنوی میں امید کی برکتوں کا بیان کیا ہے کہ ہر پیشے اور سماج کے ہر طبقے کی راحت کا راز ''امید'' میں پوشیدہ ہے۔ امید ہی پریشانی میں انسان کا سہارا بنتی ہے۔ نظم کی ابتدا امید سے براہ راست خطاب سے کی گئی ہے۔

اے مری امید مری جاں نواز اے مری دل سوز میری کارساز

عیش میں اور رنج میں میری شفیق کوہ میں اور دشت میں میری رفیق

اور پھر انسانی تاریخ میں امید کے مختلف کارناموں کے تذکرے کے بعد مثنوی اس آرزو پر ختم ہوتی ہے۔

کان میں پہنچی تری آہٹ جوں ہی　　رخت سفر یاس نے باندھا وہیں
ساتھ گئی یاس کے پژمردگی　　ہو گئی کافور سب افسردگی

تجھ میں چھپا راحت حال کا ہے بھید
چھوڑیو حالی کا نہ ساتھ اے امید

اس مثنوی میں توجہ طلب بات یہ ہے کہ حالی نے اپنی کسی پریشانی یا ایسی مشکل کا ذکر نہیں کیا ہے جس میں وہ ''امید'' سے مدد طلب کر رہے ہیں۔

چھوڑیو حالی کا نہ ساتھ اے امید

دراصل حالی کا غم اور ان کا سروکار اتنا آشکارا اور جگ ظاہر ہے کہ اسے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ قوم کی ترقی اور کھوئے ہوئے وقار کی بحالی ایسا مسئلہ ہے جس میں آدمی کا حوصلہ جواب دے جاتا ہے۔ حالی کا یہ مسئلہ تلاش معاش میں ان کے دہلی سے لاہور آنے کے بعد شروع ہوا ہے۔ قومی دھارے کا رخ موڑنے اور مغربی شعریات کو عام کرنے کی مہم شروع کرنے کے بعد ہی حالی کو مشرق کی تمام خوبیاں' عیب نظر آنے لگیں۔ حالی کی غزل کے یہ اشعار بھی ان کی اس فکر کو نمایاں کرتے ہیں۔ یہاں بھی خطاب ''امید'' سے ہی ہے۔

دیکھ اے امید کچھو ہم سے نہ تو کنارا　　تیرا ہی رہ گیا ہے لے دے کے اک سہارا
یوں بے سبب زمانہ پھرتا نہیں کسی سے　　اے آسماں کچھ اس میں تیرا بھی ہے اشارا
دنیا کے خرخشوں سے چیخ اٹھے تھے ہم اول　　آخر کو رفتہ رفتہ سب ہوگئے گوارا
انصاف سے جو دیکھا نکلے وہ عیب سارے　　جتنے ہنر تھے اپنے عالم میں آشکارا

انجمن کا پانچواں مشاعرہ 3 ستمبر 1874 کو ہوا۔ اس کا موضوع ''حب وطن'' تھا۔ حالی نے اس میں ایک مثنوی حب وطن سنائی۔ اس مثنوی کے دو اشعار توجہ طلب ہیں جن میں برطانوی حکومت کے تئیں پسندیدگی کا اظہار کیا گیا ہے۔ ملک پر بیرونی دشمنوں کے حملے کو باہمی نااتفاقی کا

نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔ لیکن دشمنوں کی اسی فہرست میں مغرب کے حملے کو استحسان کی نظر سے دیکھا گیا ہے۔ یہ اشعار فکر انگیز بھی ہیں اور عبرتناک بھی۔ حب وطن کے یہ اشعار سنئے۔

قوم جب اتفاق کھو بیٹھی — اپنی پونجی سے ہاتھ دھو بیٹھی
ایک کا ایک ہوگیا بدخواہ — لگی غیروں کی پڑنے تم پہ نگاہ
پاؤں اقبال کے اکھڑنے لگے — ملک پر سب کے ہاتھ پڑنے لگے
کبھی تورانیوں نے گھر لوٹا — کبھی درانیوں نے زر لوٹا
کبھی نادر نے قتل عام کیا — کبھی محمود نے غلام کیا
سب سے آخر کو لے گئی بازی — ایک شائستہ قوم مغرب کی
یہ بھی تم پہ خدا کا تھا انعام — کہ پڑا تم کو ایسی قوم سے کام
ورنہ دم مارنے نہ پاتے تم — پڑتی سر پہ جو وہ اٹھاتے تم
ملک روندے گئے ہیں پیروں سے — چین کس کو ملا ہے غیروں سے

نظم جدید کی تحریک کے زیر اثر اس وقت جتنی نظمیں لکھیں گئیں بیشتر میں، کبھی در پردہ اور کبھی برملا اور بے محابا حکومت برطانیہ کی تعریف کا موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا گیا۔ دراصل انجمن پنجاب کے جو بھی اغراض و مقاصد تھے، ان میں یہ ایجنڈا بھی شامل تھا کہ عوام میں انگریزوں کے تئیں جو نفرت اور غصہ ہے اسے کم سے کم تر کیا جائے۔ سن 1857 میں اہل وطن کے سر سے موج خوں گزری، اس نے عوام کو حکومت برطانیہ سے بہت دور کر دیا تھا۔ مسٹر لائنٹز اور کرنل ہالرائیڈ کی سرپرستی میں چلنے والی نظم جدید کی تحریک حکم و محکوم کے درمیان اس خلیج کو کم کرنے کی خدمت میں انجام دے رہی تھی۔ 1879 میں شائع ہوئی مسدس حالی کے یہ بند صورت حال کو مزید واضح کر دیتے ہیں۔

حکومت نے آزادیاں تم کو دی ہیں — ترقی کی راہیں سراسر کھلی ہیں
صدائیں یہ ہر سمت سے آرہی ہیں — کہ راجا سے پرجا تلک سب سکھی ہیں

تسلط ہے ملکوں میں امن و اماں کا
نہیں بند رستہ کسی کارواں کا

نہ بدخواہ ہے دین و ایماں کا کوئی　　نہ دشمن حدیث اور قراں کا کوئی
نہ ناقص ہے ملت کے ارکاں کا کوئی　　نہ مانع شریعت کے فرماں کا کوئی

نمازیں پڑھو بے خطر معبدوں میں
اذانیں ڈھڑلے سے دو مسجدوں میں

مہینوں کے کٹتے ہیں رستے پلوں میں　　گھروں سے سوا چین ہے منزلوں میں
ہراک گوشہ گلزار سے جنگلوں میں　　شب و روز ہے ایمنی قافلوں میں

سفر جو کہیں تھا نمونہ سقر کا
وسیلہ ہے وہ اب سراسر ظفر کا

اور تان اس نصیحت پر ٹوٹتی ہے۔

نہ بدخواہ سمجھو بس اب یاوروں کو　　لیٹر سے نہ ٹھہراؤ تم رہبروں کو
دو الزام پیچھے نصیحت گروں کو　　ٹٹولو ذرا پہلے اپنے گھروں کو

کہ خالی ہیں یا پر ذخیرے تمہارے
برے ہیں کہ اچھے وتیرے تمہارے

انجمن کا ساتواں مشاعرہ 14 نومبر 1974 کو منعقد ہوا۔ اس کا موضوع انصاف تھا۔ حالی نے اس موقع پر مناظرۂ رحم وانصاف کے عنوان سے ایک ڈرامائی نظم سنائی۔ جس میں انگریزوں کی بے رحمی اور سنگ دلی کا بڑے سلیقے سے دفاع کیا گیا ہے۔ نظم میں انصاف کی بے مروتی اور بے رحمی کی داستان بیان کرنے کے بعد رحم نے انصاف کو لعنت ملامت کی۔ رحم جب اپنی تقریر ختم کر چکا تو انصاف نے اپنے حق میں دلائل پیش کیے۔ لیکن انصاف کے کارناموں کی تفصیل رفتہ رفتہ اہل ہند کے لیے برطانوی حکومت کی برکتوں کا گوشوارہ معلوم ہونے لگتی ہے۔ انصاف رحم کو جواب دیتے ہوئے کہتا ہے

میٹھی باتوں میں تری زہر ہلال ہے بھرا　　تیرا آغاز تو اچھا ہے پہ انجام برا
بے مروت ہوں اگر میں تو یہ جوہر ہے مرا　　جس کو تو عیب سمجھتا ہے وہ زیور ہے مرا
میں ہی تھا جس نے کہ ویرانوں کو آباد کیا　　میں ہی تھا جس نے کہ اخباروں کو آزاد کیا

حکم سے میرے ہوئی کونسلوں کی ماموری　　رائے سے میرے بنیں سلطنتیں جمہوری
کھودیا میں نے نشاں سلطنت شخصی کا　　اور دنیا سے غلامی کو مٹا کر چھوڑا
حکم عالم میں مرا مشرق سے تا مغرب ہے عام　　جس نے مانا نہ مرا حکم رہا وہ ناکام

آخر میں عقل اسٹیج پر نمودار ہوتی ہے اور اپنی دانائی سے قضیہ کا تصفیہ کرتی ہے۔

صاف کہتی ہوں سن اے رحم نہیں اس میں خلاف　　تو ہے اک قالب بے روح نہ ہو گر انصاف
اور سن اے عدل نہیں اس میں تکلف سرِ مو　　گر نہ ہو رحم تو اک دیدۂ بے نور ہے تو
دونوں تم خلق کے ہو مأیہ آرام وشکیب　　گل وشبنم کی طرح ایک کو ہے ایک سے زیب

یہ بات بھی حیرت انگیز ہے کہ حالی کی نظموں میں عشق ومحبت وجذبات کی کوئی جگہ نہیں۔ حقیقی واقعات اور سچے جذبات پر اصرار کرنا اور محبت کے جذبے سے صرف نظر کرنا، ایک بڑی سچائی سے چشم پوشی ہے۔ حالی کی نظم میں عورت اگر ہے بھی تو، اپنی مناجاتوں کا دفتر لئے بیوہ کی شکل میں۔ نو عمر لڑکے اٹھتی جوانی میں بھی کھیتوں میں پانی دینے کے علاوہ کچھ اور نہیں کرتے۔ یہ ایک لمحۂ فکر یہ ہے کہ یہ نظمیں نیچرل شاعری کا مثالی نمونہ ہیں۔ خیال ہوتا ہے کہ نظم جدید کی تحریک میں عشق ومحبت کے جذبات پر سخت پابندی تھی۔ محمد حسین آزاد کی نظموں کا مجموعہ ''نظم آزاد'' جب شائع ہوا تو ''نظم آزاد'' کی جلی سُرخیوں کے نیچے یہ عبارت میں درج تھی۔ ''جو حسن وعشق کی قید سے آزاد ہے'' اور آخر میں بات یہ کہ حالی کی تخلیقات پڑھنے کے دوران اکثر یہ خیال ہوتا ہے کہ آقاؤں کی حمایت اور مغربی شعریات کی اشاعت، حالی نے بہت خوش دلی سے نہیں کی، حاکم وقت سے بغاوت کا ہولناک نتیجہ سن 1857 میں وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ لیکن صلح وآشتی کا راستہ اختیار کرنے میں وہ جس کرب سے گزرے اس کے نشانات ان کی تحریروں میں جا بجا ملتے ہیں۔ کبھی بین السطور کبھی برملا۔ حالی کا یہ درد بے ساختہ جھلک اٹھتا ہے۔ مسدس کا یہ بند حالی کی اس مجبوری کے پس منظر میں پڑھیے۔

زمانے کا دن رات ہے یہ اشارا　　کہ ہے آشتی میں مری یاں گزارا
نہیں پیروی جن کو میری گوارا　　مجھے ان سے کرنا پڑے گا کنارا

سدا ایک ہی رخ نہیں ناؤ چلتی
چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی

حالی کی احساسِ شکست پر لفظ سے عیاں ہے۔ حالی کی مشہور غزل سے یہ اشعار سنیئے۔

یاد اس کی دل سے دھودے اے چشم تر تو مانوں — اب دیکھنی مجھے بھی تیری روانیاں ہیں
اپنی نظر میں بھی یاں، اب تو حقیر ہیں ہم — بے غیرتی کی یارو اب زندگانیاں ہیں
ہر حکم پر ہوں راضی، ہر حال میں رہیں خوش — حصے میں اب ہمارے یہ شادمانیاں ہیں
رونے مین تیرے حالی لذت ہے کچھ نرالی — یہ خوں فشانیاں ہیں یا گل فشانیاں ہیں

یہ کس کا حکم ہے جس کے سامنے دم مارنے کا بھی یارا نہیں؟ حالی کی بے بسی نے ان کی گل فشانیوں کو خوں فشانی میں بدل دیا ہے۔

''تدبیر متاع سلطنت'' کے عنوان سے دیوان حالی میں چند اشعار ہیں، ملک میں نفرت پھیلا کر حکومت کرنے کی برطانوی پالیسی پر ایسا گہرا طنز، انگریزوں کے تئیں ان کے حقیقی جذبات کو بے نقاب کر دیتا ہے۔ نہایت خاموشی سے ملک میں نفرت کا زہر پھیلا کر، خود حکومت کرنا ان کی تدبیر سیاست کا ادنی کرشمہ تھا شعر ملاحظہ ہو۔

تدبیر یہ کہتی تھی کہ جو ملک ہو مفتوح — واں پاؤ جمانے کے لئے تفرقہ ڈالو
اور عقل خلاف اس کے تھی یہ مشورہ دیتی — یہ حرفِ سبک بھول کے منہ سے نہ نکالو
پر رائے نے فرمایا کہ جو کہتی ہے تدبیر — مانو اسے اور عقل کا کہنا بھی نہ ٹالو
کرنے کے ہیں جو کام وہ کرتے رہو لیکن — جو بات سبک ہو اسے منہ سے نہ نکالو

دراصل ہوا یہ کہ اقتدار کا جادو مفتوح قوم پر ایسا چلا کہ انھیں دم مارنے کا یارا ہی نہ ہوا۔ علامہ اقبال نے ٹھیک ہی کہا ہے۔

جادوئے محمود کی تاثیر سے چشم ایاز
دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں سازِ دلبری

❁❁❁

پروفیسر عبدالحق

دیوان حالی کا نقش اول

پانی پت کے میدان کی طرح حالی کی پامالی یا شبلی کی تحریروں کو لونی لگنے کی بات مسترد اور علمی بدمذاقی کی مثال بن چکی ہے۔ کہنے والوں کی کم نظری اور بے بصیری پر ہر دور ہنستا رہے گا۔ عمر رائیگاں کی پوری صدی پیش نگاہ ہے ادبی حوالے میں جس کثرت سے ذکرِ حالی وظیفہ لب ولسان ہے وہ میرو غالب کو بھی میسر نہ ہوسکا۔ حالی کی سادہ لوح شخصیت کا اعجاز دیکھئے کہ سیم وزر کی طرح ان کی تحریریں سکندری ودارائی کے کسی دعوے کے بغیر سکہ زد ہیں اور ہماری نقد وبنیش کو بینائی بخشنے کی موجب ہیں۔ ہماری ثقافت میں دو مقدمات ایسے ہیں جن کی نظر شاہی کہیں دست یاب ہو۔ اصل کتاب مقدمے کی نسبت سے شناخت قائم کر سکی۔ مقدمات کی شہرت نے اصل موضوع کو موخر کر دیا۔

تاریخ عالم پر ابن خلدون کی تیرہ جلدیں مقدمے کی مرہون ہیں۔ اسی طرح حالی کا دیوان مقدمے کی شہرتِ عام کا محتاج ہے۔ خلعۂ حق نے حالی کی جبین شاعری خالی رکھی تھی مقدمے نے تخلیق کی لوحِ تقدیر رقم کردی۔ برا نہ مانیے تو کہوں کہ ہماری تنقید کی یہی بوطیقا ہے اور مسلکِ تنقید کے لیے یہی کتابِ دین بھی ہے اردو کے دیار و دہر میں اسی کو شہر پروین کی سند حاصل ہوئی۔ مقبولیت اور منفعت سے قطع نظر حوالے اور مطالعے کی وجہ سے یہ کتاب کثرت سے شائع ہوتی رہی۔ بار بار کی اشاعتوں سے اصل مسودے کا مسخ ہونا ایک فطری عمل تھا۔ جس میں صحتِ متن کی طرف کم توجہ دی جاتی رہی۔ نقش اول سے انحراف نے بھی گم رہی کو راہ دکھائی، یہاں پہلی اشاعت کا سرسری تعارف پیش نظر ہے۔ مولانا کی نگرانی میں ان کی وفات سے تقریباً اکیس سال پہلے دیوان شائع ہوا۔ حالی کو دیر سے کلام کی اشاعت پر توجہ ہوئی۔ کہیں کہیں ابتدائی شاعری کو بھی شامل کرلیا گیا۔

ان کی حیات میں دیوانِ حالی غالباً دوسری بار شائع نہ ہوسکا۔ متفرق کلام منظرعام پر آتا رہا۔ شعرگوئی کا سلسلہ جاری تھا۔ اگرچہ پیرانہ سالی کے سبب کم سخنی دیکھنے میں آتی ہے ان کی وفات کے بعد دیوان کئی بار منظرعام پر آیا۔ دیوان دوحصوں میں تقسیم ہوگیا۔ مقدمہ الگ کتابی صورت میں طبع ہوتا رہا۔ نظم ونثر کی طرح شعری کلام بھی مختلف پاروں میں بٹ گیا۔ حد ہے کہ ان کی نظمیں بھی کار ثواب سمجھ کر مختلف احباب اور ادارے شائع کرتے رہے، جن میں سب سے زیادہ توجہ مدوجزر اسلام پر دی گئی۔ نظموں کے مجموعے کو الگ صورت دی گئی۔ کئی طویل نظمیں علیٰحدہ علیٰحدہ شائع ہوتی رہیں۔ جیسے مناجاتِ بیوہ ترکیب بند، چپ کی داد، چہارگلزار میں صرف چار نظمیں شامل ہیں۔ رباعیاتِ حالی، شکوۂ ہند، کلیات نظم حالی، مثنویات حالی، گلدستۂ فوائد وغیرہ کے علاوہ انتخاب غزلیات، انتخابِ دیوان، انتخاب کلیات بھی طبع ہوتے رہے۔ حالی کی زندگی میں مجموعۂ نظم حالی 1896 میں علی گڑھ سے شائع ہوا۔ 1918 تک یہ چار بار چھپا۔ اسی طرح مسدس حالی، لکھنؤ ،الہ آباد، کان پور، علی گڑھ، دہلی ولاہور سے بار بار شائع ہوتا رہا۔

بار بار کی اشاعت سے متن میں تبدیلیاں بھی غیرشعوری طور پر داخل ہوتی رہیں۔ حالی لسانی شاعر تھے۔ یہ ان کا ایک انفرادی امتیاز بھی ہے۔ تین چار سال قبل پروفیسر سلیمان اشرف نے حالی کا عربی کلام بھرپور عربی مقدمے کے ساتھ شائع کیا ہے۔ حالی کی عربی وفارسی شاعری کا محاکمہ ابھی باقی ہے۔ غالب واقبال کی ذولسانی شاعری ایک دوسرے پر سورنگ سے شناخت رکھتی ہے۔ حالی کی اردو شاعر میں عربی اشعار اور حوالے فکری وتنقیدی اشارات کے حامل ہیں۔

راقم کے پاس دیوان کا جونسخہ ہے وہ بہت بوسیدہ اور جگہ جگہ سے خراب ہے۔ کاغذ اتنا گل گیا ہے کہ اوراق کو الگ کرنا مشکل ہے۔ شکر ہے کہ انٹرنیٹ پر کسی اسٹیٹ کے کتب خانے کا محفوظ نسخہ اچھی حالت میں موجود ہے۔

پیش نظر دیوان 1893ء میں مطبع انصاری واقع دہلی میں چھپا1 اور ٹائٹل شیخ محمد رحمت اللہ رعد کے نامی پریس کان پور میں شائع ہوا۔ مقدمہ 228 صفحات اور دیوان 230 صفحات پر مشتمل

ہے، مقدمہ اور دیوان کی فہرستیں الگ الگ ہیں۔ کتابت محمد الدین نے کی ہے۔ نستعلیق کتابت بہت روشن، اور دیدہ زیب ہے۔ مقدمے کے علاوہ دیوان پر تیرہ صفحات کا دیباچہ الگ سے موجود ہے۔ آخری پیراگراف کے یہ جملے خاص اہمیت رکھتے ہیں:

> ''چند باتیں جو خاص اس مجموعہ سے علاقہ رکھتی تھیں وہ اب دیباچہ میں بیان کی گئیں۔ لیکن اگر غور کیجیے تو ان میں کوئی چیز بھی ضروری نہ تھی۔ مقدمہ اور دیباچہ لکھنا درکنار سرے سے شعر کہنے ہی کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔
>
> ''آنچہ مادر کار داریم اکثرے درکار نیست'' 2

سچ پوچھے تو دیوان کا دیباچہ ہی اصل میں مقدمہ ہے اور مقدمہ شعری اصناف کا اصلاحی تجزیہ۔ پہلی اشاعت میں حاشیے پر درج عبارتوں سے صرف نظر متون کے ساتھ منصفی نہیں ہے۔ جو بعد کی اشاعتوں میں دیکھنے میں آتی ہے ردیف ''ی'' کی غزل کا مشہور مقطع

حالی اب آؤ پیروی مغربی کریں — بس اقتدارئے مصحفی و میر کر چکے

کاتب نے حالی مغربی مصحفی کو جلی قلم سے رقم کیا ہے۔ کسی زمانے میں مغربی پر بحث کا در کھلا تھا۔ اس مقطع کے بعد جو غزل ہے وہ حالی کی دل دوز سرگذشت کا اظہار ہے۔ بیس اشعار پر مشتمل یہ غزل ہجرت نامہ یا مہاجری ادب یا غزل نما شہرآشوب ہے۔ حسب ذیل شعر ملاحظہ ہو

رہے لاہور میں آکر سو جانے — یہی دنیا ہے جو دار المحن ہے 3

مذکورہ شعر پر آٹھ جملوں میں حاشیے پر ایک نوٹ ہے کہ 1889 میں دہلی کی ملازمت چھوڑ کر لاہور جانا پڑا تھا اور وبائی مرض میں مبتلا ہوئے۔ اس طرح سے کئی غزلوں، قصیدے اور رباعی پر بھی حاشیے درج ہیں۔ ہر اشاعت میں ان کا محفوظ کیا جانا ضروری تھا، جن سے اکثر اغماض برتا گیا۔

دیوان کا آخری حصہ قطعات تاریخ کے لیے وقف ہے۔ اس پر ڈیڑھ صفحہ کا ابتدایہ بھی ہے۔ جو بہت دل چسپ ہے۔ اس کے بعد مرزا غالب کی تاریخ وفات ہے اور آٹھ اشعار پر مشتمل ہے۔ غالب کے مصرعے ''حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا'' نے تاریخ نکالی ہے۔ حالی نے شخصی

مرثیہ کی ابتدا کی ۔ جسے اقبال نے بلندی بخشی۔ ''مرثیہ غالب'' کو پڑھتے وقت اس قطعۂ تاریخ کو بھی نظر میں رکھنا چاہیے۔ کئی باتیں ایسی ہیں جو مرثیہ میں نہیں ہیں۔ خود مرثیہ کا آخری شعر حذف کر دیا گیا ہے۔ شاید عربی میں ہونے کی وجہ سے اس نظم کے ہر بند میں دس اشعار ہیں۔ نواں شعر مقطع کا ہے۔

شعر میں ناتمام ہے حالی غزل اس کی بنائے گا اب کون

بند کا دسواں یعنی آخری شعر ملاحظہ ہو۔

کَمۡ لَنَـاَ فیِـہ مِـن بُـکی وِعَوِیل وعِتَـابِ مَـعَ الزّمـانِ طـویلِ 4

نظم کے سویں شعر کا دانستہ طور پر نظر انداز کیا جانا کسی خیانت سے کم نہیں۔ افسوس ہے کہ ناچیز بھی ''متاع سخن یا متاع فن'' 5 میں آخری شعر شامل متن نہ کرنے کی غلطی کا مرتکب ہے۔ دیوان حالی کی اولین اشاعت کے وقت اس نظم کے نویں بند کا ایک شعر کاتب سے سہواً قلم بند نہ ہوسکا تھا۔ نگران کا احتیاط دیکھیے کہ انھوں نے وہ شعر حاشیے میں درج کر دیا ہے۔

حصر تھی اک بیاں میں رنگینی کیا دھرا ہے عقیق و مرجاں میں 6

اس مختصر جائزے کا مقصد ہے کہ دیوان حالی کی اشاعتِ نو پر توجہ دی جائے اور ترتیب و تدوین کے مسلمات کی روشنی میں اسے مکمل کیا جائے۔ کیوں کہ کلام حالی کی اہمیت کے پیش نظر متن کا اس طرح بکھر جانا ہماری کم نگہی کی مثال بن گئی ہے۔

پروفیسر خواجہ محمد زکریا لاہور نے اردو غزلوں اور نظموں کا انتخاب شائع کیا ہے۔ 2009 کا دوسرا ایڈیشن پیش نظر ہے۔

انتخاب زریں میں غزل موجود ہے۔ 7

نہ عیش کے خسروی رہے گا نہ صولت بہمنی رہے گی رہے گی اے منعمو! تو باقی دیے کی روشنی رہے گی

دیوان حالی میں یہ غزل نہیں ہے غزل کا انتخاب کہاں سے کیا گیا درج نہیں ہے۔ لگتا ہے کہ دیوان کی ترتیب کے بعد یہ کلام شائع ہوا۔ مصدر کی طرف اشارہ کرنا چاہیے تھا۔ دوسری غزل کے

انتخاب میں پروفیسر خواجہ محمد زکریا نے آٹھ اشعار پسند کئے باقی گیارہ اشعار حذف کردیے ہیں۔
انتخاب کا معاملہ شخصی ہے اس لئے اس میں حالی کی مشہور زمانہ غزلیں موجود نہیں ہیں۔ جیسے

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں اب دیکھیے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں

متفرقات کے ذیل میں اس غزل کے صرف دو اشعار شامل کئے گئے ہیں۔ ایک اور معروف غزل بھی انتخاب سے باہر ہے۔

گو جوانی میں تھی کجرائی بہت پر جوانی ہم کو یاد آئی بہت

انتخاب کا معاملہ ذاتی مذاقِ سخن پر موقوف ہے۔ اس لئے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ مگر بعض تخلیقات عمومی پسندیدگی کی وجہ سے زبان زد ہو جاتی ہیں۔ اسی بنیاد پر وہ نصابات کا جز قرار دی جاتی ہیں۔ انتخاب میں قلم کار کے منفرد اسلوب کی نمایندہ تخلیقات کو ہی جگہ دی جاتی ہے تاکہ اسلوب نگارش کا اندازہ ہو سکے۔

مولانا حالی نے کمال احتیاط برتا تھا کہ پرانی اور نئی غزلوں کا امتیاز باقی رہے اس لئے پہلے ایڈیشن میں قدیم غزلوں کے اندراج کے ساتھ حاشیے پر "ق" کی علامت درج کی تھی، جسے بعد کی اشاعتوں میں نظر انداز کر دیا گیا۔ اس صورت میں ارتقائے فکر واسلوب پر گفتگو مشکل ہو جاتی ہے۔ حالی نے غزلیں بہت کم لکھی ہیں۔ تقریباً سوا سو غزلیں دیوان میں موجود ہیں۔ حالی نے قطعات تاریخ بھی لکھے ہیں۔ ان سے عام طور پر نظر انداز کیا گیا ہے۔ حالی نے بھی انھیں ضرورتاً اور مجبوراً لکھا ہے۔ قطعات کے اندرراج سے پہلے دل چسپ نثری تحریر ہے۔ اس کے چند جملے ملاحظہ فرمائیں:

> "راقم کو فی الواقع مادۂ تاریخ نکالنے کی ڈھب نہیں ہے اور اگر کبھی ایسی ضرورت پیش آئی ہے تو نہایت دقت سے اکثر تعمیہ یا تخرجہ کے ساتھ اور کبھی حسن اتفاق بغیر اس کے بھی تاریخ سرانجام دی ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ مادۂ تاریخ کسی دوست نے نکال دیا اور اس پر مصرعے لگا کر تاریخ کے خود مالک بن بیٹھے۔۔۔ جب کوئی مہتم بالشان واقعہ ظہور میں آتا ہے مثلاً کسی کے اصطبل کی مرمت ہوئی یا گھوڑا آختہ کیا گیا۔ یا کسی کی

مینا مر گئی یا مرغ پالی جیتا یا بلی نے بچے دے۔ ایسے وقت میں شعرا کو مقابلے کے امتحان کا موقع مل جاتا ہے۔" 8

دیوان حالی کے اختتامی حصے میں تقریباً24 قطعاتِ تاریخ محفوظ کئے گئے ہیں عنوان درج ہے۔"قطعات تاریخ اور تاریخی جملے مقتبس از قرانِ مجید" غالب' خواجہ ناصر وزیر، میر محبوب علی خاں، ضیاء الدین خاں وغیرہ کے ساتھ کتابوں کی اشاعت، کنویں اور جہاں سرا، آئینہ خانہ اور مسجد کی تعمیر پر قطعات ہیں۔ مولانا کے برادر محترم خواجہ امداد حسین مظہر اور ان کے بیٹے حافظ اخلاق حسین کے بھی قطعات آخر میں شامل کر لئے ہیں کیونکہ بقول مولانا حالی وہ شائع نہ ہو سکے تھے اور حالی کو پسند تھے اس لئے دیوان میں بہ طور یادگار محفوظ کر لئے ہیں۔ یہ حالی کی پر خلوص شخصیت کی کشادہ دلی تھی کہ بھائی اور بھتیجے کی تاریخوں کو اپنے دیوان میں جگہ دی۔9 مولانا نے لکھا ہے کہ ان کے بھائی خواجہ باقی باللہ کی قبرستان میں مدفون ہیں۔ ان تمام اطلاعات کی حواشی اور اشارات کے ساتھ دیوان کے اشاعت نو کی ضرورت ہے۔

حواشی:

1. دیوان حالی دہلی1893
2. دیوان حالی دہلی14
3. دیوان حالی دہلی129
4. دیوان حالی دہلی163
5. متاع فن عبدالحق دہلی378
6. دیوان حالی 162
7. انتخاب زریں اردو غزل خواجہ محمد زکریا لاہور2009ء 160
8. دیوان حالی دہلی220
9. دیوان حالی دہلی230

✿✿✿

قاضی عبیدالرحمان ہاشمی

حالؔی اور تفہیم غالبؔ

مرزا غالبؔ ان معدودے چند خوش نصیبوں میں ہیں جو گزشتہ ایک صدی سے زاید عرصے میں کبھی بھی ناقدین کے حافظے سے محو نہیں ہوئے، چنانچہ اس پورے عرصے میں مسلسل ارتکاز اور توجہ کی بدولت ان کی شخصیت کے بھی نئے پہلو سامنے آئے ہیں اور شاعری کی تفہیم وتعبیر میں بھی امتیازات اور امکانات کے نئے گوشے منور ہوئے ہیں اور اب ایسا لگتا ہے کہ شاید نئی تعبیر کے امکانات باقی نہیں رہ گئے ہیں، یعنی غالب فہمی اور غالبؔ شناسی کا جو سلسلہ یادگارِ غالب (1897) سے شروع ہوا تھا، وہ آج اپنے اوجِ کمال پر پہنچ چکا ہے۔

اِس میں شک نہیں کہ یادگارِ غالبؔ، حالؔی کے تمام تر انکسار کے باوجود ایک ایسا وقیع دستاویزی کارنامہ ہے جس کی اہمیت امتدادِ زمانہ کے باوجود آج بھی باقی ہے، چنانچہ اسے ایک نیک نہاد، فرماں بردار شاگرد کی عقیدت ومحبت سے لبریز ابتدائی کوشش کہہ کر مسترد نہیں کیا جاسکتا۔

خصوصاً غالبؔ کے اردو کلام کی تشریح وتعبیر میں حالؔی کو نہ صرف اولیت حاصل ہے بلکہ یہ ایسا بھاری پتھر ہے جس کو چومے بغیر آگے نہیں بڑھا جاسکتا۔

اِس حقیقت سے بے شک انکار نہیں ہوسکتا کہ موجودہ سوانح اور کلامِ غالب پر Review اور تنقیدی تبصرے کے ذریعہ حالؔی کا مقصد اپنے استاد کی عظمت اور کمال کے ان پہلوؤں کی طرف توجہ مرکوز کرنا تھا جو ان کی بعض ذاتی کمزوریوں کے سبب لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہوگئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ تصنیف میں غالب کی جانب داری، حمایت اور مدافعت قدم قدم پر صاف نظر آتی ہے۔ علاوہ ازیں آج جس طرح متنی تنقیدی مطالعات کا عام چلن، معروضیت اور فنکار کے کارناموں

اور شخصی معاملات کو خلط ملط کرنے سے عموماً احتراز کیا جاتا ہے، پہلے اس روایت کا تصور ناپید تھا اور حالی بھی یقیناً اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔

یہاں یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ حالی ایک نظریہ ساز نقاد بھی تھے۔ مقدمے میں پیش کردہ مشرقی شعریات کے بارے میں ان کے تنقیدی مفروضات وتصورات کی وقعت اور اہمیت کا یہ عالم ہے کہ ان کی گونج ایوانِ تنقید میں آج بھی سنی جاسکتی ہے۔

حالی نے مقدمے میں روایت اور جدت کے اپنے معروف نظریے کے ضمن میں شاعری میں جن اوصاف یعنی سادگی، اصلیت اور جوش کی وکالت اور حمایت کی ہے— کلامِ غالب کو اس کے عملی اطلاق کا پہلا موقعہ اور پہلا حدف کہا جاسکتا ہے، لیکن یہ عجیب اتفاق ہے— جسے کسی حد تک بنیادی تنقیدی موقف سے انحراف بھی کہا جاسکتا ہے کہ جب غالب کی تفسیر وتعبیر میں شاعرانہ فکر کی جدت وندرت کو نمایاں کرنے کی نوبت آتی ہے تو وہاں میزانِ قدر یکسر بدلی نظر آتی ہے تاہم وہ اپنے اِس بدلے ہوئے ذہنی رویے اور تنقیدی طریق کار کا جواز اِس طرح پیش کرتے ہیں، فرماتے ہیں:

"ہم دیکھتے ہیں کہ جب میر وسودا اور ان کے مقلدین کے کلام میں ایک ہی قسم کے جذبات اور مضامین دیکھتے دیکھتے جی اکتا جاتا ہے اور اس کے بعد مرزا کے دیوان پر نظر ڈالتے ہیں تو اِس میں ہم کو ایک دوسرا عالم دکھائی دیتا ہے۔"

حالی مزید لکھتے ہیں:

"مرزا معمولی اسلوبوں سے تا بہ مقدور بچتے تھے اور شارع عام پر چلنا نہیں چاہتے تھے اس لیے وہ بہ نسبت اس کے کہ شعر عام فہم ہوجائے اس کو زیادہ پسند کرتے کہ طرزِ بیان اور طرزِ خیال جدت اور نرالا پن پایا جائے، جس قدر بلند اور عالی خیالات مرزا کے ریختہ میں نکلیں گے اس قدر کسی ریختہ گو کے کلام میں نکلنے کی توقع نہیں ہے۔"

کلامِ غالب میں طرزِ بیان اور طرزِ خیال کی جدت وندرت کی حد تک مقدمے کے بیان میں کچھ زیادہ تفاوت نہیں ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ عملی تشریحات میں حالی گھوم پھر کر ہمیشہ خود کو

شعری موضوعات و مضامین کی وضاحت تک محدود رکھتے ہیں، چنانچہ یادگارِ غالب کی تصنیف کا مقصد بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''اس کتاب کے لکھنے سے شاعری کے اس عجیب وغریب ملکے کا لوگوں پر ظاہر کرنا ہے جو خدائے تعالیٰ نے مرزا کی فطرت میں ودیعت کیا تھا اور جو کبھی نظم ونثر کے پیرائے میں، کبھی ظرافت و بذلہ سنجی کے روپ میں، کبھی عشق بازی اور رندمشربی کے لباس میں اور کبھی تصوف وحب اہل بیت کی صورت میں ظہور کرتا تھا، بس جو ذکر ان چار باتوں سے علاقہ نہیں رکھتا۔ اس کتاب کے موضوع سے خارج سمجھا جائے۔''

وہ مزید فرماتے ہیں:

> ''مرزا کو بحیثیت شاعر روشناس کرانے اور ان کی شاعری کا پایہ لوگوں کی نظر میں جلوہ گر کرنے کا عمدہ طریقہ یہ تھا کہ جو باتیں مرزا کی خصوصیات سے ہیں، وہ نقل کی جائیں۔ جو کلام نقل کیا جاتا اس کی لفظی ومعنوی خوبیاں، نزاکتیں اور باریکیاں ظاہر کی جائیں۔''

اس میں کوئی شک نہیں کہ کلامِ غالب کی تشریحات میں غالب کی شاعرانہ فکر کی بلندی اور انفرادیت کو نشان زد کرنے میں حالی کو بہت کچھ کامیابی ملی ہے، تاہم انھوں نے اپنی تعبیرات میں نہ صرف یہ کہ غالب کے ہاں فکری تنوع، خلاقانہ ذہن کی پیدا کردہ معنوی تہہ داری، کائنات اور انسانی آلام کے سلسلے میں ان کے روحانی کرب اور گہرے فلسفیانہ سروکار کو بہت کم درخورِ اعتنا سمجھا ہے، بلکہ ان شعری وفنی وسائل Devices اور جمالیاتی سرچشموں کی بھی جستجو کرنے کی ضرورت کم ہی محسوس کی ہے جس کے طفیل اس مرصع شعری کائنات میں نادیدہ مناظر کی ارزانی ہوتی ہے۔

تنقیدی دعووں اور عملی انطباق کی صورت میں بعض الجھنوں اور دشواریوں کے باوجود یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ یادگارِ غالب آج بھی غالب شناسی کے مرحلے میں ایک مستحسن ترین کارنامہ ہے جس کی منزلت میں وقت گزرنے کے ساتھ اضافہ ہوتا گیا ہے۔

✿✿✿

ضیاء الرحمٰن صدیقی

حالی اور تعلیم نسواں

خواجہ الطاف حسین حالی کو عام طور پر بحیثیت شاعر، نقاد سوانح نگار اور سماجی مصلح تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن حالی کی شاعری کے جس قدر پہلو اور جہتیں اردو شعر و ادب کا حصہ ہیں ان میں سب سے اہم پہلو ان کی شاعری میں تحریک تعلیم نسواں اور مساواتِ نسواں کا تصور ہے۔ حالی اردو کا پہلا FEMINST شاعر ہے جس نے اردو شاعری میں پہلی بار فیمنزم FEMINSM کا نظریہ پیش کیا اور تحریک تعلیم نسواں اور مساوات نسواں کے علمبردار کی حیثیت سے اپنی ایک الگ پہچان بنائی اور پہلی بار اس نوع کے اصلاحی موضوع کو اپنے تخلیقی پاروں میں جگہ دی۔ غالباً اسی لیے دور جدید میں حالی کے افکار و نظریات کا اطلاق اور Relevence بہت گہرا نظر آتا ہے۔

مولانا حالی کا مطالعہ بہت وسیع تھا انھوں نے اسلامیات کے علاوہ عالمی سطح پر دیگر مذاہب کا مطالعہ بھی بہ نظر غائر کیا تھا۔ حالی کے نظریات کو سمجھنے کے لیے اگر تاریخ کے اوراق پر نظر ڈالیں اور عورت کے حوالے سے ماضی کے دریچے وا کریں تو اس ذیل میں عورت کی قدر و قیمت اور اہمیت کا تجزیہ اس طرح کیا جا سکتا ہے۔

ہندو Mythology کے مطابق سوم دیوتا نے اپنی ساری پاکیزگی عورت کو عطا کی، اس کے علاوہ گویائی مٹھاس گندھرو دیوتا نے دی، اگنی دیوتا نے عورت کو چمک دمک بخشی تاکہ یہ دنیا کی سب سے خوبصورت مخلوق بن سکے۔ علاوہ ازیں دنیا کی تمام طاقتیں عورت سے منسوب ہیں۔ مثلاً دولت کو لکشمی سے، ذہانت و ذکاوت کو سرسوتی سے اور درگا کو طاقت کی علامت کہا گیا ہے۔ مہابھارت میں عورت کو قابل احترام ہستی تسلیم کیا گیا ہے۔

آریہ سماج اور برہمو سماج نے بھی تعلیم نسواں پر زور دیا۔ عیسائی مشنریوں نے ہمیشہ Women Education میں دلچسپی لی۔ چارلس ڈکن نے 1854 میں اپنے ایک مشہور خط

میں عورتوں کی تعلیم پر زور دیا ہے۔عورتوں کی ترقی میں جن خواتین نے کارہائے نمایاں انجام دیے ان میں رکما بائی اور راما بائی کے نام قابل ذکر ہیں۔ایشور چند ودھیا ساگر نے ودھوا آشرم کھولے، پارسیوں نے خواتین کے لیے مختلف قسم کی تعلیم فراہم کی انڈین نیشنل سوشل کانفرنس نے عورتوں کی تعلیمی ترقی کے لیے مختلف اقدامات کیے۔

آریوں نے پرانوں میں عورت کا تذکرہ بڑے احترام کے ساتھ کیا ہے۔مسلم خواتین میں عطیہ بیگم، سعیدہ بیگم، اعلیٰ بی، اور سلطان جہاں بیگم فرمارروائے بھوپال تاریخ کے ایسے نام ہیں جنھوں نے مساوات نسواں کو بڑی اہمیت دی۔

مسلم سلاطین نے عورت کے لیے محبت اور عزت کا اعتراف تاج محل کی شکل میں کیا۔

ان سب سے قطع نظر چودہ سو سال قبل قرآن میں سورۂ نساء کے ذریعہ تعلیم نسواں کا تصور ہم تک پہنچ چکا تھا۔یہ تمام تاریخی شواہد وحقائق حالی کے پیش نظر تھے۔حالی نے بھی اردو شاعر کے حوالے سے پہلی بار تعلیم نسواں اور مساوات نسواں کو نہ صرف اپنے فن پاروں کا موضوع بنایا بلکہ عملی طور پر بھی اس کا مثبت تصور پیش کیا۔

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ دنیا کی ہر زبان کی ابتدا نظم سے ہوئی۔بعدازاں نثر کا ارتقا عمل میں آیا اردو زبان کے ابتدائی نمونے بھی نظم میں ملتے ہیں صوفی سنتوں نے بھی اپنا پیغام نظم کے ذریعہ عوام وخواص تک پہنچایا۔

مولانا حالی نے بھی عورتوں کے مسائل ومعاملات اور ان کی طرز معاشرت کو نظم کے ذریعہ عام کرنے کی سعی کی۔انھوں نے شعر و ادب کو محض مسرت و انبساط کا ذریعہ تصور نہیں کیا۔وہ مقصدیت کے قائل تھے اور شاعر کی تاثیر سے فائدہ اٹھانا ضروری سمجھتے تھے، ان کا خیال تھا کہ شاعری زندگی کو بہتر بنانے اور اعلیٰ اقدار پیدا کرنے میں معاون ثابت ہوسکتی ہے اور دنیا میں اس سے بڑے عظیم کام لئے جاسکتے ہیں۔

اپنے اس خیال کی تائید میں انھوں نے کئی مثالیں بھی پیش کی ہیں۔فرانسیسی مفکر سارتر کا کہنا ہے کہ موسیقی اور مصوری سے صرف لطف لیا جاسکتا ہے اس سے پیغمبری کا کام نہیں لیا جاسکتا۔حالی نے

سارتر کی اس نظریے کی شدت سے تردید کی ہے۔

حالی ابن خلدون کی اس رائے سے بھی اختلاف کرتے ہیں کہ شاعری میں لفظ ہی سب کچھ ہے معنی کی زیادہ اہمیت نہیں ہے۔ اس کے برعکس حالی کا خیال ہے کہ شاعر میں لفظ و معنی دونوں کی یکساں اہمیت و افادیت ہے۔

مذکورہ مباحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ حالی کا جھکاؤ ہمیشہ معنی کی طرف رہا ہے وہ شاعری میں پیغمبری کے قائل تھے۔

حالی نے مختلف سطحوں پر اپنے پیغام کا بیشتر حصہ نظم کے ذریعہ ہی پیش کیا تعلیم نسواں اور مساوات نسواں حالی کا اولین پیغام تھا اور وہ اسے ایک مشن Mission کے طور پر تصور کرتے تھے۔

حالی نے اپنے اس پیغام کو عام کرنے کے لیے جو تخلیقی فن پارے پیش کیے ان میں بیٹیوں کی نسبت، مسدس حالی، مناجات بیوہ اور چپ کی داد قابل ذکر ہیں۔ علاوہ ازیں مجالس النساء کے نام سے حالی نے ایک ناول بھی لکھا تھا۔ نظم ''مناجات بیوہ'' میں ہندوستانی سماج کی ایک بیوہ کے مسائل اور اس کی ابتر حالت کو نہایت ہی پرسوز انداز میں پیش کیا ہے۔ اس نظم کے ذریعہ انھوں نے ایک بے بس عورت کی آواز کو عوام و خواص تک پہنچانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

'چپ کی داد' حالی کی تخلیقی کائنات میں واحد نظم ہے جس میں انھوں نے عورت کی اہمیت اور اس کی تعلیم سے متعلق بڑی جامع اور موثر گفتگو کی ہے۔

اے ماؤں، بہنوں، بیٹیوں، دنیا کی زینت تم سے ہے ۔ ملکوں کی بستی ہو تمہیں قوموں کی عظمت تم سے ہے
تم گھر کی ہو شہزادیاں، شہروں کی ہو آبادیاں ۔ غمگین دلوں کی شادیاں دکھ سکھ میں راحت تم سے ہے
فطرت تمہاری ہے حیا طینت میں ہے مہر و وفا ۔ گھٹی میں ہے صبر و رضا انساں عبارت تم سے ہے
نیکی کی تم تصویر ہو، محنت کی تم تقدیر ہو ۔ ہو دین کی تم پاسباں، ایماں سلامت تم سے ہے
تم آس ہو بیمار کی ڈھارس ہو تم بے کار کی ۔ دولت ہو تم نادار کی عسرت میں عشرت تم سے ہے
آتی ہو اکثر بے طلب دنیا میں جب آتی ہو تم ۔ پر موہنی سی اپنے یاں گھر بھر پہ چھا جاتی ہو تم
میکے میں سارے گھر کی تھیں گو مالک و مختار تم ۔ پر سارے کنبے کی رہیں بچپن سے خدمت گار تم

سسرال میں پہنچیں تو واں اک دوسرا دیکھا جہاں ۔ جا اتریں گویا دیس سے پردیس میں اک بار تم
واں فکر تھی ہر دم یہی ناخوش نہ ہو تم سے کوئی ۔ اپنے سے رنجش کے کبھی پاؤ نہ واں آثار تم
بدلے نہ شوہر کی نظر سسرے کا دل میلا نہ ہو ۔ آنکھوں میں ساس اور نند کی کھٹکو نہ مثل خار تم
غم کو غلط کرتی رہو سسرال میں ہنس بول کر ۔ شربت کے گھونٹوں کی طرح پی رہو خون جگر

عورت کی اہمیت کا احساس اس طرح دلاتے ہیں۔

وہ دین اور دنیا کے مصلح جن کے وعظ و بند سے ظلمت میں باطل کی ہوا' دنیا میں نور حق عیاں
وہ علم و حکمت کے بانی جن کی تحقیقات سے ظاہر ہوئے عالم میں اسرارِ زمین و آسماں

مردِ نیک ہو یا بد عورت کے ساتھ ان کا کیسا سلوک اور کس طرح کا رویہ رہتا ہے۔ حالی نے ان اشعار میں بیان کیا ہے۔

کی تم نے اس دار المحن میں جس تحمل سے گزر زیبا ہے گر کہیے تمہیں فخر بنی نوع بشر
تم نے تو چین اپنے خریداروں سے بھی پایا نہ کچھ شوہر ہوں اس میں یا پدر یا ہوں برادر یا پسر
الفت تمہاری کر گئی گھر دل میں جس بے دید کے وہ بدگماں تم سے رہا اے بد نصیبو عمر بھر

حالی نے جب ہوش سنبھالا تو انھیں اپنے چاروں طرف زبوں حالی' سماجی ابتری اور بربادی کا سماں نظر آیا۔ عورتوں کی ابتر حالت سے وہ بہت مایوس ہوئے جس کا اظہار انھوں نے اس طرح کیا ہے۔

گو نیک مرد اکثر تمہارے نام کے عاشق رہے پر نیک ہوں یا بد رہے سب متفق اس رائے سے
جب تک جیو تم علم و دانش سے رہو محروم یاں آئی ہو جیسی بے خبر ویسی ہی جاؤ بے خبر
تم اس طرح مجہول اور گم نام دنیا میں رہو ہو تم کو دنیا کی' نہ دنیا کو تمہاری ہو خبر
جو علم مردوں کے لیے سمجھا گیا آب حیات ٹھہرا تمہارے حق میں وہ زہر یلا ہل سربسر
آتا ہے وقت انصاف کا نزدیک ہے یوم الحساب دنیا کو دینا ہوگا ان حق تلفیوں کا واں جواب

حالی کھلی آنکھ کا شاعر تھا انھوں نے سادہ انداز میں گہری حقیقتوں کا دھیمے لہجے میں سچے اور کھرے جذبات کا اظہار کیا۔ حالی نے دل کو لبھانے والی بات نہیں کی بلکہ دل میں چبھنے والی بات کہی اور شاعری سے قوم کی اصلاح کا کام لیا۔

زمانۂ جاہلیت میں عرب میں لڑکیوں کو زندہ دفن کر دینے کی رسم بہت عام تھی حالی کے درد مند دل نے سماج کے اس الم ناک رویے کو شدت سے اثر قبول کیا اور انھوں نے ایک نظم 'بیٹیوں کی نسبت' کے عنوان سے قلم بند کی۔

جاہلیت کے زمانہ میں یہ تھی رسم عرب — کہ کسی گھر میں اگر ہوتی تھی پیدا دختر
سنگ دل باپ اسے گود سے لے کر ماں کی — گاڑ دیتا تھا زمین میں کہیں زندہ جا کر
جاہلیت میں تو تھی اک یہی آفت کہ وہاں — گاڑ دی جاتی تھی بس خاک میں تنہا دختر
ساتھ بیٹی کے مگر اب پدر و مادر بھی — زندہ در گور سدا رہتے ہیں اور خستہ جگر

حالی نے اپنی زندگی کے اڑتیس برس سرسید کے ساتھ گذارے ،وہ ذاتی طور پر بھی سرسید سے بہت متاثر تھے اگر چہ سرسید کبھی عورتوں کی تعلیم کے حق میں نہیں رہے۔ان کے یہاں تعلیم نسواں کا عملی طور پر کوئی مثبت تصور نہیں ملتا۔

رشید جہاں کے والد شیخ عبداللہ نے علی گڑھ میں خواتین کے لیے جب ایک گرلس اسکول قائم کیا تو سرسید نے یہ کہتے ہوئے معمولی سا اختلاف کیا کہ ابھی اس کی ضرورت نہیں ہے۔ شیخ عبداللہ نے 1906 میں خاتون کے نام سے ایک رسالہ بھی جاری کیا تھا۔البتہ ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے ناولوں میں خواتین کے مسائل کو مختلف انداز میں پیش کیا ہے۔اردو کے عظیم شاعر علامہ اقبال بھی یہ کہہ کر گذر گئے۔

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ — یا

ہند کے شاعروں، صورتگرو افسانہ نویس — آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

حالی نے انگریزی ادب سے جو کچھ اخذ کیا وہ نقل کی صورت میں نہیں بلکہ تصرف کی شان ہے۔ حالی کے تخلیقی پارے شاعری کے علاوہ فکشن میں بھی موجود ہیں۔مجالس النسا حالی کا ایک اہم ناول ہے جو بالترتیب سات مجالس پر مشتمل ہے۔اس ناول میں عورتوں کے ساتھ مسائل و معاملات سے بحث کی گئی ہے۔لیکن ناول کی تیسری مجلس میں عورتوں کی تعلیم سے متعلق خاطر خواہ بحث ملتی ہے۔

حالی وہ پہلے واحد مصلح قوم شاعر تھے جنھوں نے چہار دیواری میں قید ایک عورت کی بے بسی اور

ناداری کو محسوس کیا اور اسے الفاظ کی بینائی عطا کی۔ ان کے پیشِ نظر ہمیشہ عورتوں کے حقوق ان کی عظمت و حرمت کے تحفظ کا مسئلہ زیرِ غور رہا۔

حالی نے محسوس کیا کہ اگر عورت کو علم کی دولت سے محروم رکھا گیا تو مستقبل میں آنے والی نسلیں علم سے محروم رہ جائیں گی۔ اس سے ملک و قوم کی ترقی متاثر ہوگی۔ لہٰذا حالی نے عورت کو ذہنی آزادی، باعزت زندگی، انصاف، گھریلوں آزادی اور تمام تر سماجی حقوق کا مستحق قرار دیا۔

مولانا حالی حافظِ قرآن تھے وہ مذہبی علوم کا بھی گہرا مطالعہ رکھتے تھے ان کے درد مند دل میں عورت کی عظمت اس سے محبت، اس کے حقوق کی پاسداری اور برابری کا احساس جاگزیں تھا۔ ان تمام تر حقوق کو انھوں نے نہایت ہی موثر طریقے سے عوام و خواص میں عام کیا اور اس عمل کی ابتدا انھوں نے بذاتِ خود اپنے خاندان کی عورتوں سے کی مثلاً شرعی اعتبار سے جائیداد میں عورتوں کا حصہ، شادی سے قبل لڑکیوں سے ان کی رائے لینا، جہیز کی مخالفت، بیواؤں، نادار عورتوں اور یتیم بچوں کے ساتھ حسنِ سلوک، ان کی عزت و حرمت کا تحفظ مزید یہ کہ عورتیں اپنے جن حقوق سے نابلد تھیں انھیں ان کے حقوق سے آگاہ کرانا۔ یہ وہ عزائم تھے جنھیں حالی ہمیشہ اپنی زندگی کا مشن تصور کرتے رہے اور تاحیات اپنے ان مقاصد کی تکمیل میں لگے رہے۔

ایک مجبور اور نادار عورت کے داخلی جذبات و احساسات کی ترجمانی وہی فن کار کر سکتا ہے جس کے دل میں عورت کی عظمت اور سماج میں اسے سر بلند کرنے کا جذبہ جاگزیں ہو۔ اس جذبے میں ماں کی عظمت، بیٹیوں کی حوصلہ افزائی اور بہنوں کے حقوق شامل ہیں۔

حالی نے 1894 میں پانی پت میں اپنے گھر سے متصل لڑکیوں کے لیے چوتھی جماعت تک ایک اسکول بھی شروع کیا تھا جس میں اردو، تاریخ، حساب کے علاوہ امور خانہ داری سے متعلق بھی مضامین مثلاً سلائی، کڑھائی وغیر کی تعلیم کا انتظام تھا۔ لڑکیوں کو تعلیم دینے کے لیے ایک عیسائی خاتون ٹیچر کا انتخاب کیا گیا چند برس بعد یہ اسکول بند کرنا پڑا۔ کیونکہ بچوں کے والدین نے ایک عیسائی ٹیچر کو قبول نہیں کیا اور اس وقت کوئی مسلم خاتون ٹیچر دستیاب نہ ہوسکی۔ اسکول بند ہونے کی

وجہ ہندوستان میں انگریزوں کی مخالفت تھی۔

حالی کی ازدواجی زندگی بھی بہت کامیاب تھی وہ ہمیشہ اپنے خاندان کی خواتین کو بڑی عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اپنی بیوی کے تند و تیز مزاج ہونے کے باوجود ان سے ہر بات پر مشورہ کرتے اور ہمیشہ ان سے بڑی خوش اخلاقی سے پیش آتے۔

حالی اردو کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے پہلی بار سختی سے عورتوں کے حقوق کی پامالی کے خلاف آواز بلند کی وہ ہمیشہ Empowerment of Women کے نظریے پر قائم رہے اور اس کی تلقین بھی کرتے رہے۔

آج وہی موضوعات و مسائل ہندوستانی سماج میں زیر بحث ہیں، عورتوں کا وجود آج بھی خطرے میں ہے۔ ان کی عزت و آبرو کا تحفظ ایک سوالیہ نشان بنا ہوا ہے۔ مثلاً بیوگی کا مسئلہ، لڑکیوں کی شادی کا مسئلہ، آبرو کے تحفظ کا مسئلہ، بزرگ ماں باپ کی بقا Survival کا مسئلہ یہ وہ مسائل ہیں جن پر ہندوستانی سماج کو سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ وہی نظریات ہیں جو آج سے ڈیڑھ سو سال قبل حالی نے اپنی شاعری کے ذریعہ ہندوستانی سماج کے سامنے پیش کیے تھے۔

وقار ادب، افتخار سخن، ناقد و سوانح نگار اور محبِ وطن حالی نے مسدس حالی میں پوری کائنات کو خدا کا کنبہ کہا ہے۔ ادب کے ہر گوشہ میں انھوں نے نئی راہیں تلاش کیں اور وہ ہمیشہ فکر و فن کی نئی جہتوں کے متلاشی رہے۔

'چپ کی داد' حالی کی ایک ایسی شاہکار نظم ہے جو ان کے تعلیم نسواں اور مساوات نسواں کے نظریے کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔ دور جدید میں حالی کے ان افکار و نظریات کی تفہیم و احتساب کی سخت ضرورت ہے۔ حالی کے ان نظریات کا اطلاق نہ صرف ہندوستانی سماج میں ناگزیر ہے بلکہ ان کے یہ افکار و نظریات عالمی سطح پر بھی مشعل راہ کا درجہ رکھتے ہیں۔

✿✿✿

مظہر محمود

مسدس مدو جزر اسلام: ایک زوال پذیر معاشرے کا لازوال رزمیہ

انقلاب 1857 کی ناکامی کے بعد ملک وقوم انتشار و بے بسی کا شکار ہو چکی تھی۔ تاریخِ ہند ایک تہذیب، ایک نظام اور معاشرے کو دم توڑتے دیکھ رہی تھی۔ معاشرہ ایک کرب مسلسل میں مبتلا نظر آتا تھا۔ لیکن ساتھ ہی اس دم توڑتے معاشرے کے خمیر سے نئی تہذیب اور نئے معاشرے کا جنم ہو رہا تھا۔ اس مایوسی اور غفلت کی فضا کو تبدیل کرنے کا بیڑا ملک وملت کے مصلحین واکابرین نے اٹھایا۔ ملک کے طول وعرض میں کئی سماجی، معاشی اور مذہبی تحریکیں عالمِ وجود میں آئیں۔ اہل ہنود میں برہمو سماج، آریہ سماج کی تحریک، راجا رام موہن رائے وغیرہ کی اصلاحی جدوجہد نے خود اعتمادی اور بیداری کی لہر پیدا کی۔ یہ تحریکیں تاریخی جبر کے ایک فطری ردعمل کے نتیجے میں وجود میں آئی تھیں، نہ کہ کسی سماجی تضاد یا محدود نظریۂ فکر کے باعث۔ ٹھیک اسی طرح اہل اسلام میں بھی ایک مثبت اور روشن مستقبل کی تعمیر کی مہم کے طور پر سرسید احمد خاں اور ان کے رفقاء نے قوم کی فلاح وبہبود کا بیڑا اٹھایا جو بہت جلد ایک مؤثر تحریک کی شکل اختیار کر گیا۔ جس طرح سوامی وویکانند، راجا رام موہن رائے اور پنڈت مدن موہن مالویہ نے اپنے دور میں اپنے حلقۂ فکر وعمل اور سماج کے بڑے طبقے میں مذہبی اور سماجی اصلاحات اور تعلیمی بیداری اور احیا کا کام کیا تھا جو کہ بڑا مثبت، تعمیری اور وسیع النظری کا کام تھا، اسی طرح مولانا سید احمد بریلوی اور مولانا فضل حق خیرآبادی کی مذہبی تحریکوں نے اور سرسید احمد خاں، مولانا الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی، ڈپٹی نذیر احمد وغیرہ کی ادبی اور اصلاحی تحریک نے بڑی وسیع القلبی کے ساتھ احیائے قوم کو اپنا نصب العین بنایا اور ان سب باشعور عالموں اور دانشوروں نے سماجی، مذہبی اور تعلیمی میدانات میں انقلاب لانے کی سعی کی۔

الطاف حسین حالی تاریخ اسلام اور اس کے تمام نشیب و فراز پر گہری نظر رکھتے تھے۔ مذہبیات کے مطالعے کے ساتھ ساتھ تاریخ، شعر و ادب اور اخلاق و فلسفہ بھی ان کا میدانِ علم و عمل تھا۔ انہوں نے نہ صرف دینی تعلیم کا وسیع اور گہرا مطالعہ کیا تھا بلکہ وہ یوروپی ممالک کے تاریخی، مذہبی، سیاسی اور عسکری منظر نامے سے بھی واقفیت رکھتے تھے۔ وہ اسلامی معاشرے اور یوروپی تہذیب کا ماضی اور حال کے تناظر میں بڑی گہرائی سے تقابلی مطالعہ کر چکے تھے۔ وہ ملت کے عصری چیلنجوں اور تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے اور ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے لیے قوم کے دل و دماغ کی آبیاری کرنے کا ہنر جانتے تھے۔ الطاف حسین حالی بذاتِ خود ایک فرشتہ صفت، منکسر المزاج، پر خلوص اور اعلیٰ انسانی اقدار کے حامل شخص تھے۔ خواجہ غلام الثقلین نے انہیں ''صاحب باطن ولی'' قرار دیا۔ راس مسعود نے انہیں انسان نہیں بلکہ فرشتہ کہا۔ صالحہ عابد حسین نے انہیں ''صداقت و شرافت کا آئینہ دار'' ٹھہرایا۔

خواجہ الطاف حسین حالی کی مقبول ترین نظم ''مسدس مد و جزر اسلام'' 1879 میں پہلی بار شائع ہوئی۔ اب تک ملک اور بیرون ملک میں اس کے سینکڑوں ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ انگریزی اور دیگر اہم زبانوں میں اس کے ترجمے بھی شائع ہوئے ہیں۔ نامور صحافی خوشونت سنگھ نے ہندوستانی مسلمانوں کی روح کو سمجھنے کے ضمن میں مسدس حالی کو تاریخی اور ادبی اہمیت کا حامل شاہکار قرار دیا ہے۔ انگریزی زبان میں کرسٹوفر شیکل اور جاوید مجید نے مسدس حالی کا ایک معیاری ترجمہ جامع تعارف کے ساتھ لکھا۔ بقول خوشونت سنگھ:

> It is "a work of at most historical and literary importance... a must for anyone who wants to delve into the psyche of muslim India"

جسے آکسفورڈ یونورسٹی پریس نے 1997 میں شائع کیا تھا۔ انگریزی ہی میں ایک اور مربوط ترجمہ مع تعارف کے سیدہ سیدین حمید نے بھی کیا ہے جو 2003 میں قرۃ العین حیدر کے پیش لفظ

کے ساتھ منظر عام پر آ چکا ہے۔ یہ مسدس دراصل اہل اسلام کے عروج وزوال کی دردانگیز داستان ہے اور اردو ادب کے لیے حالی کا ایک لازوال تحفہ تصور کی جاتی ہے۔ حالی نے مسدس کے توسط سے ملت کی زبوں حالی کی تصویر کشی کرتے ہوئے ان میں حمیت وغیرت کے جذبات بیدار کرنے اور انہیں موجودہ پستیوں سے نکل کر روشن مستقبل کی تعمیر کے لیے عملی جدوجہد کی طرف مائل کرنے کی سعی کی ہے۔

گھٹا سر پہ ادبار کی چھا رہی ہے فلاکت سماں اپنا دکھلا رہی ہے
نحوست پس وپیش منڈلا رہی ہے چپ وراست سے یہ صدا آرہی ہے
کہ کل کون تھے آج کیا ہو گئے تم ابھی جاگتے تھے ابھی سو گئے تم

خواجہ الطاف حسین حالی مسدس کے دیباچہ میں اپنی اس طویل نظم کے پس منظر کے بارے میں خود یوں رقم طراز ہیں کہ:

''اس مسدس کے آغاز میں پانچ سات بند تمہید کے لکھ کر اول عرب کی اس ابتر حالت کا خاکہ کھینچا ہے جو ظہور اسلام سے پہلے تھی اور جس کا نام اسلام کی زبان میں جاہلیت رکھا گیا۔ پھر کوکب اسلام کا طلوع ہونا اور نبی اُمّی کی تعلیم سے اس ریگستان کا سرسبز وشاداب ہو جانا اور اس ابر رحمت کا امت کی کھیتی کو رحلت کے وقت ہرا بھرا چھوڑ جانا اور مسلمانوں کا دینی اور دینوی ترقیات میں تمام عالم پر سبقت لے جانا بیان کیا ہے۔ اس کے بعد اس کے تنزل کا حال لکھا ہے اور قوم کے لیے اپنے بے ہنر ہاتھوں سے ایک آئینہ خانہ بنایا ہے جس میں آکر وہ اپنے خدوخال دیکھ سکتے ہیں کہ ہم کون تھے کیا ہو گئے۔'' (حالی دیباچۂ مسدس مدوجزر اسلام)

اس مسدس کی تعریف اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی تھی کہ خود سر سید احمد خاں جنہوں نے اس نظم کو تحریر کرنے کی حالی کو ترغیب دی تھی وہ لکھتے ہیں کہ ''بیشک میں اس کا محرک ہوا، اور اس کو میں ان اعمال حسنہ میں سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا کہ تو کیا لایا تو میں کہوں گا حالی سے مسدس

لکھوالایا ہوں اور کچھ نہیں۔'' مولوی عبدالحق نے بجا طور پر لکھا ہے کہ ''یہ مسدس ہماری قومی زندگی کا کامل مرقع ہے، جس میں ہمارے خدوخال صاف صاف نظر آتے ہیں۔ پھر حسن بیان نے اسے معراج کمال تک پہنچایا۔''

پیغمبر حضرت محمد ﷺ کے احترام وعقیدت کے اظہار کی خاطر ہر دور میں شعرا نے نعت گوئی کی ہے، لیکن مسدس مدجزر اسلام میں جس عقیدت، ارادت، حقیقت اور صداقت کے ساتھ نعتیہ اشعار حالی نے پیش کیے ہیں اس کا کوئی ثانی نہیں۔ بے شک حالی کے زمانے سے لے کر تا حال مسدس کے یہ بند زبان زدِ خاص وعام رہے ہیں۔

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا — مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا — وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا، ضعیفوں کا ماویٰ — یتیموں کا والی، غلاموں کا مولیٰ
خطا کار سے درگزر کرنے والا — بد اندیش کے دل میں گھر کرنے والا
مفاسد کا زیر و زبر کرنے والا — قبائل کو شیر و شکر کرنے والا
اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا — اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

حالی نے بے شک قوم کے درد کو اس انداز میں پیش کیا کہ وہ خود بھی آنسو بہاتے رہے اور قارئین وسامعین کو بھی چشم نم کے ساتھ پڑھنے وسننے پر مجبور کرتے رہے۔ برصغیر ہندو پاک کے بڑے شہروں میں تعلیم یافتہ خاندانوں سے لے کر گاؤں، دیہاتوں تک کے ان پڑھ لوگوں پر بھی مسدس کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ نظم قارئین کے دلوں پر گہرا اثر کرتی ہے۔ اسے پڑھ کر لوگ بے اختیار جھومنے اور رونے لگتے ہیں۔ بہت تھوڑے عرصے میں یہ نظم ملک کے طول وعرض میں غیر معمولی شہرت کی حامل ہوگئی۔ اس کے منتخب حصے اسکولوں اور مدرسوں کے نصاب میں شامل کیے گئے۔ میلادالنبیؐ کے موقعوں اور محفلوں میں اس کے بند پڑھے جانے لگے۔ 1857 کے ناکام انقلاب کے بعد ملک میں جمود وتعطل کی جو فضا طاری ہوئی تھی مسدس حالی نے اسے توڑنے کی

بڑی موثر اور کارگر سعی کی۔ اس نظم کے توسط سے حالی نے خود اعتمادی اور اجتماعی شناخت کا شعور بیدار کیا۔ مولانا الطاف حسین حالی نے مسلم معاشرے کے انحطاط کی وجوہات کا گہرائی سے مطالعہ کیا اور پایا کہ ان میں خود تعصبات اور قدامت پرستی بھی ہے اور دیگر بشری و داخلی کمزوریاں اور خامیاں بھی موجود ہیں۔ ساتھ ہی انہوں نے مسائل کے حل کرنے لیے غور وفکر کرنے کی تلقین کی ہے۔ قوم کے ہر طبقے کی سچی تصویر کشی کی ہے اور وقتِ ضرورت سربراہانِ قوم کی مفاد پرستی کی جانب بھی اشارے کیے ہیں۔ دور جدید کے نئے حقائق کا سامنا کرنے کی ضرورت پر بھی زور دیا ہے۔ باہمی اتفاق واتحاد کے وسیلے سے زندگی کے مختلف شعبوں میں بتدریج ترقی کرنے کے راز کا بھی انکشاف کیا ہے اور غفلت کے انجام سے خبردار بھی کیا ہے۔ مسدس میں غفلت کے انجام سے متعلق چند اشعار پیش خدمت ہیں۔

جہاز ایک گرداب میں پھنس رہا ہے — پڑا جس کے جوکھوں میں چھوٹا بڑا ہے
نکلنے کا رستہ نہ بچنے کی جا ہے — کوئی ان میں سوتا کوئی جاگتا ہے
جو سوتے ہیں وہ مست خوابِ گراں ہیں — جو بیدار ہیں ان پہ خندہ زناں ہیں
کوئی ان سے پوچھے کہ اے ہوش والو! — کس امید پر تم کھڑے ہنس رہے ہو!
برا وقت بیڑے پہ آنے کو ہے جو — یہ چھوڑے گا سوتوں کو اور جاگتوں کو!
بچو گے نہ تم اور نہ ساتھی تمہارے — اگر ناؤ ڈوبی تو ڈوبیں گے سارے

اگر چہ کہ حالی نے مسدس میں قوم کی حالت زار کی عکاسی کی ہے لیکن ان کا مقصد محض حوصلہ شکنی نہیں تھا بلکہ وہ قوم میں حرکت وعمل اور عزم وحوصلے کے جذبات ابھارنا چاہتے تھے۔ ان میں خود داری غیرت، حمیت، اخوت، مساوات اور امید کے جذبات بیدار کرنا چاہتے تھے۔ لہٰذا مسدس کے ضمیمے میں انہوں نے خصوصی طور پر یہ اشعار شامل کیے۔

بس اے ناامیدی نہ یوں دل بجھا تو — جھلک اے امید اپنی آخر دکھا تو
ذرا ناامیدوں کو ڈھارس بندھا تو — فسردہ دلوں کے دل آخر بڑھا تو

ترے دم سے مردوں میں جانیں پڑی ہیں جلی کھیتیاں تو نے سرسبر کی ہیں

الطاف حسین حالی کی اس سعی مشکور کو بعض کوتاہ نظر اربابِ حل وعقد فرقہ واریت سے تعبیر کرتے ہیں اور ان میں علیٰحدگی پسندی کے عناصر کی تلاش کرتے ہیں۔ جس کا دور دور تک کوئی گمان بھی نہیں کیا جاسکتا۔ دراصل 1957 کی شکست وریخت اور تہذیب ومعاشرے کی پسپائی اور نئی تہذیب ونئے معاشرے کے آغاز کی مکمل کیفیات کو حالی نے مسدس میں قلمبند کیا ہے۔ مسدس مدجزر اسلام قوم کا مرثیہ بھی اور رزمیہ بھی۔ اس میں قوم کے ماضی کا تذکرہ ایسے مؤثر انداز میں کیا گیا ہے کہ فخر سے سر بلند ہو جاتا ہے اور حال کی پستی کا بیان ایسے دردناک انداز میں کیا گیا ہے کہ آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں۔ مسدس حالی کے بارے میں ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے اپنے تاثرات ان الفاظ میں بیان کئے ہیں: ''یہ ایک الہامی کتاب ہے اس کو تاریخِ ارتقائے اردو ادب میں ایک سنگ میل سمجھنا چاہیے۔ یہ ایک تارا ہے جو اردو شاعری کے افق پر طلوع ہوا۔ اسی نظم سے ہندوستان میں قومی اور وطنی نظموں کی بنیاد پڑی۔''

''مسدس مدجزر اسلام'' کی اہمیت ومعنویت سے انکار کسی طور ممکن نہیں۔ اس نظم کی ضرورت، اہمیت، معنویت وافادیت جتنی عہد حالی میں تھی اگر ہم غور کریں تو آج بھی اس سے کم نہیں ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ مسدس حالی زوال میں مبتلا قوم کو اپنی خامیوں اور کوتاہیوں سے واقف کراتی ہے اس میں بلا کا سوز وگداز ہے۔ اس میں فصاحت، صداقت اور حقیقت کے جوہر ہیں، جوش وجذبہ اور خطابت کے ساتھ ساتھ اصلاحِ معاشرہ کا واضح نصب العین بھی ہے۔ بے شک مسدس حالی اصلاحِ ملت کے موضوع پر ایک لافانی شاہکار نظم کا درجہ رکھتی ہے۔

✿✿✿

ڈاکٹر شاداب تبسم

الطاف حسین حالی خطوط کے آئینے میں

انیسویں صدی کے نصف آخر میں جن مصلحین و اکابرین نے ملک اور قوم کی تعمیر و ترقی کے لئے گراں قدر خدمات انجام دیں الطاف حسین حالی کا شمار ان کی صف اول میں کیا گیا ہے۔ حالی کی ذات صلاحیتوں کا مجموعہ تھی۔ وہ ایک عظیم شاعر، ادیب، نثر نگار، مصلح، ناقد، سوانح نگار سب کچھ تھے اور ہر جگہ انھوں نے اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا ہے۔ ایک طرف تو قرآن پاک ان کے سینے میں محفوظ تھا دوسری طرف مشرقی شاعری بالخصوص فارسی اور اردو شعرا کے کلام کے بہترین نمونے ذہن میں گردش کرتے رہتے تھے۔ بقول حنیف نقوی:

> ''اردو نثر میں انہیں تنقید کی بنیاد گزار کی حیثیت سے شرف اولین حاصل ہے نظم میں جدید شاعری کے بانیوں میں ان کا نام سب سے نمایاں اور ان کا کلام سب سے زیادہ مقبول ہے۔
> اردو میں سوانح نگاری کی حیثیت سے ان کا جو مقام ہے اس سے بھی سب بخوبی واقف ہیں۔'' 1

حالی کے خطوط ان کی شخصیت ان کے افکار و نظریات اور ان کے گرد و پیش کے بارے میں معلومات کے ایک ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ خطوط اپنی سادگی اور پرخلوص انداز کی وجہ سے خاص کشش رکھتے ہیں۔ حالی اپنی تحریروں میں اگر روتے ہوئے نظر آتے ہیں تو صرف آنکھیں نم کرنے کی حد تک اور ہنستے ہیں تو زیر لب مسکرانے تک۔ حالی اپنے خطوط میں ایک سیدھے سچے انسان کی حیات کا عکس نظر آتے ہیں۔ خطوط میں نہ علمیت کی نمائش ہے اور نہ انداز بیان کے جادو جگانے کی خواہش نظر آتی ہے۔ خطوط میں جو بات کہی گئی ہے نہایت سادگی اور خلوص کے ساتھ فن خطوط نگاری کی یہی وہ اہم خصوصیت ہے جس کے باعث ایک ایک خط ادبی شہ پارے کا درجہ حاصل کرلیتا ہے۔ کیونکہ سادگی کی وجہ سے مکتوبات اور دیگر اصناف ادب میں فرق قائم ہوجاتا ہے۔ خطوط حالی کے تین مجموعے دستیاب ہیں:

1۔مکتوبات حالی (حصہ اول)، مرتبہ سجاد حسین

2۔مکتوبات حالی (حصہ دوم)، مرتبہ سجاد حسین

3۔مکاتیب حالی: مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی

مکتوبات حالی (حصہ اول) مرتبہ سجاد حسین ۔اس مجموعہ میں دوسوبیس مکتوبات درج ہیں۔ یہ خطوط زمانی اعتبار سے 1902 تا 1912 کے عرصے پر محیط ہیں۔ یہ تمام خطوط نواب وقار الملک انتصار مولوی مشتاق حسین کے نام ہیں۔ مقدمہ مولوی عبدالحق نے لکھا ہے۔ یہ مجموعہ 1925 میں شائع ہوا۔

مکتوبات حالی (حصہ دوم) اس مجموعہ میں پانچ سو بائیس خطوط ہیں۔ مجموعہ چارسو ستاون پر مشتمل ہے۔ اس مجموعہ میں حالی کے بھتیجے تصدق حسین کے نام اکیاسی اور حالی کے چھوٹے فرزند سجاد حسین کے نام چارسو اکتالیس خطوط درج ہیں۔ خطوط 1889 سے 1913 کے عرصہ پر محیط ہیں۔ دونوں جلدوں کا کاغذ ہلکے بادامی رنگ کا ہے۔ صالحہ عابد حسین ان کے خطوط کے مجموعوں ''مکتوبات حالی'' کے متعلق لکھتی ہیں:

''حالی کے خطوط کے دو مجموعے مکتوبات حالی کے نام سے 1925 میں حالی پریس پانی پت نے شائع کیے تھی۔ جواب دستیاب نہیں ہے۔ اب تو یہ مجموعہ جیسا بھی چھپا تھا نایاب ہے۔'' 2

خوش بختی سے یہ دونوں مجموعے جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کی ذاکر حسین لائبریری اور مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں موجود ہیں۔

مکاتیب حالی، مرتبہ۔اسماعیل پانی پتی

یہ مجموعہ تین حصوں پر مشتمل ہے۔ حصہ اول میں اردو کے ترپین خطوط ہیں۔ جو کہ صفحہ پندرہ سے ایک سوگیارہ تک درج ہیں۔ پہلے تین خط محمد حسین آزاد دہلوی کے نام اور آخری خط وجاہت حسین جھنجھانوی کے نام ہے اردو خطوط کے کل مکتوب الیہم کی تعداد اڑتیس ہے۔ حصہ دوم میں فارسی کے خطوط درج ہیں۔ ان کی تعداد آٹھ ہے اور مکتوب الیہم کی تعداد چھ ہے۔ سوم حصہ سات عربی مکتوب پر مشتمل ہے۔ اس مجموعہ میں کوئی خط سرسید کے نام نہیں ہے۔ غالب کے نام صرف

ایک خط فارسی میں ملتا ہے۔ جس میں غالب کے استفسار پر نظیری کے ایک شعر کی تشریح کی گئی ہے۔ عربی خطوط کا اردو ترجمہ بھی درج ہے۔

اس مجموعہ کا پیش لفظ اسماعیل پانی پتی نے لکھا ہے۔ اس پیش لفظ سے ایک اہم نکتے کی وضاحت ہوتی ہے کہ 1924 میں مولانا حالی کے بیٹے سجاد حسین کی فرمائش پر اسماعیل پانی پتی نے حالی کے خطوط دو جلدوں میں مرتب کیے۔ لیکن ''مکتوبات حالی'' کی دونوں جلدوں میں اسماعیل پانی پتی کا کہیں نام نہیں ملتا۔ اسماعیل پانی پتی لکھتے ہیں:

''1924 میں میں نے مخدومی خواجہ سجاد حسین صاحب (فرزند ارجمند مولانا حالی مرحوم) کے ارشاد کے ماتحت ان کے محترم والد کے خطوط کا ایک ضخیم مجموعہ مرتب کیا تھا۔ جو دو جلدوں میں ''حالی پریس'' سے چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔ اس وقت تک مختلف ذرائع سے جس قدر خطوط مہیا ہو سکے تھے وہ ان دونوں حصوں میں جمع کر دیے گئے تھے۔ اس کے بعد میں نے مزید کوشش حضرت مولانا مرحوم کے دیگر خطوط فراہم کرنے کی شروع کی۔ اس بات کو آج 26 برس ہو چکے ہیں۔ 3

اردو میں تنقید اپنے حقیقی مفہوم کے ساتھ حالی سے شروع ہوتی ہے۔ نقادوں نے ''مقدمہ شعر وشاعری'' کو اردو تنقید کا حرف اول اور حرف آخر کہا ہے۔ جب مولانا حالی کو اپنا دیوان شائع کرنے کا خیال پیدا ہوا تو ساتھ ہی اس پر ایک مقدمہ کے ذریعہ شاعری کی ماہیت پر بحث کرنے کا خیال بھی ذہن میں آیا۔ اس قسم کے ارادے کا اظہار کرتے ہوئے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''میں ایک لمبا چوڑا مضمون مسلمانوں کی شاعری پر لکھنا چاہتا ہوں جس میں زمانہ جاہلیت سے لے کر آج تک ان کی شاعری کی حقیقت لکھی جائے گی اور عربی و فارسی اور اردو تینوں زبانوں کی شاعری پر بحث کی جائے گی۔ مقصود اس سے یہ ہے کہ اردو کی شاعری جو نہایت خراب اور مضر ہوگئی ہے اس کی اصلاح کے طریقے بنائے جائیں اور ظاہر کیا جائے کہ شاعری اگر عمدہ اصول پر مبنی ہو تو کس قدر قوم اور وطن کو فائدہ پہنچا سکتی ہے۔'' 4

حالی کے خطوط کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خیالات جو کبھی متفرق اشعار میں مسدس

میں اور 'حیات ِسعدی' میں شیخ سعدی کی غزلیات سے متعلق بیان کیے گئے ہیں۔ حالی ان خیالات سے باقاعدہ مروجہ شاعری کی اصلاح کرنا چاہتے تھے۔لندن کے عربی رسالہ ''نحلہ ادبیہ'' جلال الدین سیوطی کی کتاب ''المذھر'' کی تلاش میں علی گڑھ اور ناہن کا سفر بھی اس غرض سے کیا۔مقدمہ کے اشاعت کے سلسلے میں اخراجات کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس دیوان کی لاگت میرے تخمینہ سے بہت بڑھ گئی ہے۔ گیارہ سو روپے مطبع انصاری میں صرف ہوا اور کچھ اوپر سو روپیہ کانپور میں لوح کے چھپوانے اور کتابوں کو بھیجنے وغیرہ میں لگا ہے اور چالیس روپیہ مہینہ جو علی گڑھ میں پانچ مہینے تک میرا صرف ہوا ہے اور ڈیڑھ سو روپے جو ناہن کے سفر میں خرچ ہوا تھا، وہ بھی محض مقدمہ لکھنے کی غرض سے صرف ہوا ہے۔''5

مقدمہ کی اشاعت کے ذکر کے علاوہ مولانا حالی نے اکثر خطوط میں قدیم شاعری کے انداز کو ناپسند کیا ہے اور مغربی خیالات کی طرف توجہ دلائی ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

''آپ یقین جانیے کہ میں اس زمانے کی لٹریری ترقی کے آگے ایسی تحریرات کو جو میری طرح محض اردو فارسی کے مردمیدان ہیں۔ لاشئے محض جانتا ہوں۔ ہم لوگ سینگ کٹا کر بچھڑوں میں شامل ہو گئے ہیں۔ ورنہ پرانے خیالات کا اثر ہمارے دل سے بالکل نہیں گیا۔''6

اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ خیالات حالی کی افتادہ ذہن کے آئینہ دار ہیں۔ مسدس میں جن خیالات کا اظہار ملتا ہے وہ اب اور زیادہ واضح ہونے لگا ہے۔ اس میں سرسید اور نذیر احمد کی آواز کی گونج سنائی دیتی ہے۔ نذیر احمد کے ناولوں اور دیگر تحریروں میں بھی جابجا قدیم شاعری سے بے زاری کا اظہار ملتا ہے۔

الطاف حسین حالی شاعری کے جمالیاتی پہلو کے مخالف نہیں تھے لیکن مبالغہ کے خلاف تھے۔ اس لیے مقدمہ میں جھوٹ اور مبالغہ سے اختلاف کرتے ہوئے بھی شاعری کو جادوگری مانتے ہیں۔ مقدمہ کی اشاعت کے بعد جب قومی نظموں کا سلسلہ شروع ہوا تو حالی اس سے مطمئن نہیں تھے۔ ظفر علی خاں کی نظم ''رود موسیٰ'' جو دکن ریویو میں شائع ہوتی تھی کو پڑھ کر ظفر علی خاں کے نام

ایک خط میں لکھتے ہیں:

''جنوری کا دکن ریویو سامنے رکھا ہوا تھا جس کو تفصیلی نظر سے اب تک نہ دیکھا تھا۔ سرے ہی پر آپ کی نظم جو ''ردِ موسیٰ'' پر لکھی گئی تھی۔ نظر پڑی۔ اول سے آخر تک بہت غور سے اور بڑے شوق کے ساتھ پڑھی۔ میرا حال اب یہ ہوگیا ہے کہ پرانی طرز کی نظمیں تو (الاماشاء اللہ) اس لیے دیکھنے کو جی نہیں چاہتا کہ ان میں کوئی نئی بات دیکھنے میں نہیں آتی اور نئے طرز کی نظموں میں گو مضامین نئے نئے ہوتے ہیں مگر وہ چیز جس کو شاعری کی جان کہنا چاہیے اور جس کو 'جادو' کے سوا کسی اور لفظ کے ساتھ تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ کہیں نظر نہیں آتی لیکن اس نظم کو دیکھ کر میں متحیر ہوگیا۔''

اسی خط میں آگے لکھتے ہیں:

''اگر آپ جیسے دو چار آدمی ملک میں پیدا ہو جائیں تو کچھ امید پڑتی ہے کہ نئی شاعری چل نکلے۔ مجھے تو مسلمانوں کے دکھڑے نے اتنی مہلت ہی نہیں دی کہ نیچر کے مظاہر پر کبھی کچھ طبع آزمائی کرتا۔'' [7]

حالی کے خطوط میں موضوعات کا تنوع اور اسلوب کا حسن دونوں ملتے ہیں۔ لب ولہجہ پرخلوص اور سلجھا ہوا ہے۔ خطوط حالی کی اپنی زندگی کی کہانی سناتے ہیں۔ خانگی اور ذاتی موضوعات کے علاوہ وہ مدرستہ العلوم سے متعلق اور وطنی نیز ملی مباحث کا احاطہ کرتے ہیں۔ خطوط میں ان کے نظریات وعقائد سے بھی پردہ اٹھتا ہے۔ ان کے متین، بردبار، پرخلوص اور منکسر المزاج سیرت اور شخصیت کے مختلف پہلو بھی سامنے آتے ہیں۔ حالی کے خطوط کی تعریف کرتے ہوئے مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

''خطوں سے انسان کی سیرت کا جیسا اندازہ ہوتا ہے وہ کسی دوسرے ذریعہ سے نہیں ہو سکتا۔ ان خطوں میں وہ مکتوب الیہ سے بلکہ اکثر اوقات اپنے سے آپ باتیں کرنے لگتا ہے جو خیال جس طرح اس کے دل میں ہوتا ہے اسی طرح قلم سے ٹپک پڑتا ہے۔ نہیں بلکہ وہ اپنا دل کاغذ کے ٹکڑوں پر نکال کر رکھ دیتا ہے اور اگر وہ دل ایسا ہو جو سراسر درد سے

لبریز ہو جن میں ہمدردی بنی نوع انسان کوٹ کوٹ کر بھری ہو، جو پریم کے رس سے سینچا گیا ہو، تو بتاؤ کہ اس کے دل کی تراوش کیسی ہوگی؟ اگر تم اس دل کی زیارت کرنا چاہتے ہو تو آؤ اور دیکھو کہ وہ پاک دل ان خطوں میں لپٹا ہوا ہے۔"8

خط کو کیونکہ "نصف ملاقات" کہا جاتا ہے تو اس "نصف ملاقات" کی ابتدائی گفتگو میں مخاطبت کے الفاظ کو القاب کہتے ہیں۔ ہر دور کے مکتوب نگار نے جب بھی اس "نصف ملاقات" کا لطف لینا چاہا تو اس نے اپنی طبیعت کی موزونی اور برجستگی کے پیش نظر مکتوب الیہ کو نئے القاب سے مخاطب کیا ہے۔ کسی خط نویس نے پرانے مروجہ انداز کو موثر مانا اور کسی کو ندرت اور انفرادیت میں مراسلہ نگاری کا حسن نظر آیا۔ الطاف حسین حالی کیونکہ اخلاص و مروت کے مرقع تھے، اس لیے ان تجربات میں پڑنے کے بجائے سیدھی سی بات کہہ دیتے ہیں ان کے خطوط میں القاب سادے اور مختصر ہیں مثلاً مکرمی، برخوردار، مائی ڈیئر، مولانا، جناب نواب صاحب، جناب من وغیرہ۔ القاب و آداب کی بے پروائی اور بے نیازی نے ان کے خطوط کو ایک دلکشی اور انفرادی رنگ عطا کر دیا ہے۔

"مکتوبات حالی"، میں زیادہ تر خطوط ایسے ہیں جو عزیز و اقارب کے نام ہیں اور جن میں روزمرہ کی معمولی باتیں آئے دن کے آلام و افکار اپنی اور دوسروں کی بیماری و مصیبت کا ذکر ہے۔ حالی ایک اعلیٰ پایہ کے ادیب اور شاعر تھے۔ اس کے باوجود ان کے مزاج میں بے حد انکساری اور فروتنی تھی۔ یہ خوبیاں دلوں میں گھر کر لیتی ہیں اور ان کی طرف سے دل میں محبت پیدا کر دیتے ہیں۔ حالی کے پاک دل کی تراوش کا اندازہ ان کے اس خط سے لگایا جا سکتا ہے جو انھوں نے اپنی پوتی8 کو لکھا تھا:

"تمہارا خط عین انتظار میں پہنچا۔ اس کو پڑھ کر سب کا جی بے انتہا خوش ہوا اور تمہاری پھوپھی کی آنکھوں سے خوشی اور محبت کے جوش میں بے اختیار آنسو ٹپک پڑے تم نے اتنی دور جا کر اپنی محبت سب کے دل میں بڑھا دی ہے۔ تمہاری دادی ہر وقت تمہاری صحت وسلامت کی دعا کرتی رہتی ہیں۔"9

اسی خط میں اپنی پوتی کو اخلاقی تعلیم بھی دیتے ہیں۔ ان کی پوتی ایک بزرگ خاندان سے ملنے

نہیں گئیں۔ان کو شکایت کی صورت بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ایک خط بھائی فیاض حسین کے مکان کے پتے سے دادی کے نام بھی بھیجنا اور اس میں لکھنا کہ مجھے چلتے وقت آپ سے نہ ملنے کا بہت افسوس ہے۔ روانگی کے دن میرا ارادہ آپ کے پاس آنے کا تھا مگر مجھے اتنی فرصت کسی نے نہ لینے دی۔''10

مولانا الطاف حسین حالی کے ایک نواسے خواجہ عبدالولی جو ایک لاعلاج مرض میں مبتلا تھے۔ مولانا اس کی بہت ناز برداری کرتے تھے۔دنیا کا کوئی علاج ایسا تھا جو انھوں نے نہ کیا ہو۔اس کی وجہ سے مولانا کی زندگی بہت تلخ تھی۔ایک خط میں سجاد حسین کو لکھتے ہیں:

''22اگست کو عبدالولی کو لے کر موضع بابو تحصیل کرنال میں مکھن رانگھڑ کے پاس گیا تھا جو مرگی کا علاج کرتا ہے۔اس لڑکے کی بیماری نے میری اور اس کی ماں کی زندگی تلخ کردی ہے۔یہ ایک پر درد اور لمبی داستان ہے جو تحریر میں نہیں آسکتی۔''11

دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

''زندگی وبال ہوگئی ہے۔''12

خواجہ عبدالولی اپنے چچا کے پاس گئے تو انھوں نے اس کو بہت نصیحت آمیز خط لکھا۔یہ خط بہت ہی طویل ہے۔اس میں حالی نے عبدالولی کو سمجھایا کہ اسے وہاں کس طرح رہنا چاہیے۔ددھیال اور ننہال والوں کے برتاؤ کا فرق بتایا ہے۔خط بہت ہی سادہ، صاف ستھری زبان میں لکھا ہوا ہے کہ بچہ پڑھ کر سمجھے اور اثر قبول کرلے۔حالانکہ خط میں ساری باتیں معمولی ہیں لیکن اس خط سے انشا پردازی کی قوت کا اندازہ ہوتا ہے۔عبدالولی کو نصیحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنے کو متحمل اور بردبار بنادے تاکہ رنج اور راحت دونوں حالتوں میں ہمیشہ خوش رہے جو طریقہ ددھیال کی تربیت کا ہے یہ طریقہ خدا تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ برتتا ہے۔کبھی بیمار کردیتا ہے کبھی تندرست کردیتا ہے۔کبھی افلاس بھیجتا ہے، کبھی آسودگی دیتا ہے تاکہ دنیا کے ہر ایک مزے سے واقف ہوں اور ہمیشہ خوش رہتے رہتے ان کے مزاج میں فرعونیت پیدا نہ ہونے پاوے۔''13

اچھے خطوط کی خوبی جہاں بے ریائی و سادگی ہے وہیں خطوط مکتوب نگار کی شخصیت کی مکمل عکاسی بھی کرتے ہیں۔ وہ خطوط جن میں سیرت و شخصیت کا ہر پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ ادب کی جان کہے جاسکتے ہیں۔

حالی کے خطوط ان کی مکمل سیرت و شخصیت کا آئینہ ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ تکلف اور تصنع سے پاک ہیں۔ خطوط میں وہ انسان نظر آتا ہے جو خانگی جھگڑوں میں الجھا ہوا ہر کسی سے جھک کر اور کھلے دل سے ملتا ہے۔ قوم کی سفارش کرتا ہوا ہر جگہ نظر آتا ہے۔ حالی کے خطوط سے متعلق سید عبداللہ لکھتے ہیں:

> ''عام طور پر حالی کے خطوط کو بھی سرسید کے ضمن میں جگہ دی جاتی ہے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ دونوں مصلحین ایک جان دو قالب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دونوں کے یہاں دردمندی ہے، قوم کی غمگساری ہے اور ملکی وملی مسائل سے والہانہ وابستگی ہے۔ ان کی یہی پرائیویٹ زندگی ہے۔ وہ خلوت اور جلوت دونوں میں ایک ہی چال ڈھال اختیار کرتے ہیں۔ ان کے ظاہر اور باطن، احساسات اور جذبات دونوں غم میں ڈوبے ہوئے ہیں، اس لیے حالی کے خطوں میں بھی سرسید کے خطوط کی طرح یکسانیت اور وحدت نظر آتی ہے۔ 14

معین الدین عقیل لکھتے ہیں:

> ''حالی کے مکاتیب میں حقیقت کی پرخلوص سادہ بیانی ہے اور ان کے خط ان کے ذات سے زیادہ ان کے مکتوب الیہ کے حالات اور ذہنی کوائف پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ان میں مکتوب الیہ کے لیے اطمینان بخش پیغام ملتا ہے مگر دل میں خوشی پیدا کرنے والے عناصر نہیں۔ مدرسۃ العلوم سید احمد خاں کی تحریک کی ناقدری اور مسلمانوں کی عام حالت پر جو خطوط انھوں نے تحریر کیے ہیں وہ بہت پراثر ہیں۔ اکثر خطوط قوم کی ناقدری کا مرقع ہیں۔'' 15

حالی کی سیرت کا سب سے اہم جز ان کی انصاف پسندی اور دل کا بغض و کینہ جیسے جذبات سے پاک ہونا ہے۔ یہ دونوں صفات آدمیت کا جوہر ہیں۔ مہدی حسن افادی نے حالی اور شبلی کی معاصرانہ چشمک لکھی ہے لیکن حالی کے خطوط میں ہم عصروں پر تنقید تو درکنار، طالب علموں کے اعتراضوں کا بھی احترام ملتا ہے۔ خطوط کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا شبلی نے ''حیات

جاوید'' کی اشاعت کے بعد جو رویہ اختیار کیا تھا اس میں اختلاف کا پہلو زیادہ حاوی رہا لیکن شبلی کی نسبت حالی کی رائے تھی کہ:

''آپ کا وجود قوم کے لیے باعث فخر ہے۔ خدا تعالی آپ کو بہت مدت تک زندہ سلامت رکھے''16

ایک جگہ شبلی کی تصنیف دستۂ گل کی (فارسی غزلیات کا مجموعہ) کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دستۂ گل پہنچا، میں نے اس مجموعہ کا نام تو احسن اللہ خاں ثاقب سے جو ابھی میرے ہاں مہمان رہ کر گئے ہیں سنا تھا اور مجھے یاد پڑتا ہے کہ لائبریری پانی پت میں میں نے اسے منگوانے کو لائبریرین سے کہہ دیا تھا مگر اب تک دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اب جو آپ نے عنایت فرمایا تو اول سے آخر تک اس کو دیکھا کوئی کیونکر مان سکتا ہے کہ یہ اس شخص کا کلام ہے جس نے سیرت النعمان، الفاروق اور سوانح مولانا روم جیسی مقدس کتابیں لکھی ہیں۔ غزلیں کا ہے کو ہیں شراب دو آتشہ ہے جس کے نشے میں خمار چشم ساقی بھی ملا ہوا ہے۔''17

حالی اپنے ساتھیوں یعنی دوسرے مصنفین سے کتنی محبت و خلوص رکھتے تھے اس کا اندازہ حالی کے خطوط کے مطالعے سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ سید احمد دہلوی کے کسی کام کے لیے کتنی دل سوزی سے سفارش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مولوی سید احمد دہلوی مصنف ''فرہنگ آصفیہ'' خدمت والا میں آتے ہیں۔ جو امر کہ ان کو ایسے سفر دور دراز پر جرأت کرنے کا باعث ہوا ہے اس کو آپ بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ ان کے لیے کسی سفارشی کی ضرورت نہیں۔ ان کی سفارش خود ان کی واجب الرحم حالت ہے جس کا کسی قدر اندازہ آپ مولوی سید علی صاحب بلگرامی کی رپورٹ سے جو آپ کے پاس موجود ہے کر سکتے ہیں۔ میں یہ عریضہ صرف اس لیے لکھتا ہوں کہ حیدر آباد سے چلتے وقت میں نے ان کے باب میں آپ کی خدمت میں کچھ عرض کیا تھا۔ اس وقت جناب نے کسی قدر مجبوری ظاہر فرمائی تھی مگر با ایں ہمہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ دل سے ان کی اعانت و امداد کرنے پر آمادہ ہیں۔''

اسی خط میں آگے لکھتے ہیں:

ان کو پچیس سال کی محبت و جانفشانی کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ پیدا ہو اور آپ کی عنایت اور توجہ کی بدولت اسلام کی ایک لازوال نشانی یعنی زبان اردو ہندوستان میں ہمیشہ کے لیے جڑ پکڑ پائے۔ یہ احسان صرف مولوی سید صاحب پر نہیں بلکہ تمام ہندوستان پر عموماً اور ہندوستان کے مسلمانوں پر خصوصاً سمجھنا چاہیے۔''18

حالی کے خطوط جہاں قوم و ملک اور معاشرے کے حالات کا عکس ہیں وہیں حالی مکتوب الیہ کو اپنے ماحول میں شامل کر لیتے ہیں۔ بعض خطوط میں موسم مثلاً گرمی اور بارش کا ذکر ملتا ہے۔ ایک خط میں موسم کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

''بارش کا حال بھی کوئی لکھو کہ ہوئی یا نہیں ہو یہاں ابھی بارش نہیں ہوئی مگر سہارنپور وغیرہ سے بارش کی خبریں آئی ہیں۔19

خطوط کے ذریعہ مکتوب نگار کی سوانح عمری مرتب کی جاسکتی ہے۔ مکتوب نگار کے ماحول اور عہد بہ عہد بدلتے ہوئے حالات و نظریات کا علم بھی خطوط کے ذریعہ ہی ہوتا ہے۔ حالی کے خطوط میں پانی پت کے آس پاس پھیلنے والی بیماریوں کا ذکر ملتا ہے۔ کئی خطوط میں طرح طرح کے عوارض خاص طور سے اپنی آنکھ کی تکلیف کا ذکر کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''ایک آنکھ سے بالکل نظر نہیں آتا۔ دوسری آنکھ میں بھی موتیا کا پانی آنا شروع ہو گیا ہے۔ داہنی آنکھ بنوانے کا ارادہ ہے لیکن کھانسی کی وجہ سے فروری تک آپریشن کرانا ملتوی کر دیا ہے۔''20

''میری داہنی آنکھ میں پانی اتر آیا ہے۔ اوائل اپریل میں قدح کرانے کی غرض سے لکھنؤ جانے کا ارادہ ہے۔ لکھنا پڑھنا تقریباً بالکل بند ہے۔''21

''میں نے جب سے آنکھ بنوائی ہے۔ لکھنا پڑھنا اور خود اخبار وغیرہ کو دیکھنا تقریباً بالکل چھوڑ دیا ہے۔ کیونکہ اب تک کوئی عینک بنی ہوئی آنکھ پر ٹھیک نہیں ٹھی اور ڈاکٹر کی تاکید ہے کہ جب تک عینک نہ لگے لکھنے پڑھنے سے پرہیز کرنا چاہیے اس لیے سوا اشد ضرورت کے خط نہیں لکھتا۔''22

اپنی بیماری کے ساتھ اپنے دوستوں یا ہم عصروں کی بیماری کا ذکر بھی خطوط میں ملتا ہے۔ مولانا شبلی کی صحت کے لیے فکرمند رہتے ہیں۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

''آپ کی حالت نازک ہوگئی تھی اور مرض کو حد سے زیادہ امتداد ہوگیا تھا۔ باوجود یہ کہ تبدیل آب وہوا کی بہت ضرورت تھی مگر آپ کو اس کا موقع نہیں ملا۔ 23

مولانا شبلی کی عیادت کے لیے جانے کا ارادہ رکھتے ہوئے ان کے فرزند مولوی حامد نعمانی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

بہت دن سے ارادہ کر رہا ہوں کہ میری پوتی یعنی غلام الثقلین کی اہلیہ جو لکھنو میں ہیں اس سے ملنے لکھنؤ آؤں اور وہاں سے مولانا کو دیکھنے کو اعظم گڑھ آنے کا بھی قصد ہے مگر اب تک ایسے مواقع پیش آتے رہے کہ ارادہ پورا نہیں ہوسکا۔ اگر لکھنؤ آنا ہوا تو اعظم گڑھ آنے سے پہلے آپ کو وہاں اطلاع دوں گا۔ 24

محسن الملک کی بیماری سے متعلق لکھتے ہیں:

''بمبئی میں مولوی مہدی علی خاں (نواب محسن الملک) سخت بیمار ہوگئے تھے اور ان کی طرف سے مایوسی ہوگئی تھی اور غلام الثقلین اسی وجہ سے بہت پریشان تھے۔ مگر اب بہت افاقہ ہے۔'' 25

حالی کے خطوط اس وقت کے لکھے ہوئے ہیں جب خانگی حالات کچھ اطمینان بخش نہ تھے۔ ان کے ایک نواسے عبدالولی کو مستقل عارضہ لاحق ہوگیا تھا۔ مختصر یہ کہ زندگی کے آخری بیس سال حالی نے جس تکلیف میں گزارے اس کا اندازہ ان کے خطوط سے لگایا جا سکتا ہے۔ حالی نے ذاتی عوارض کی تفصیلات بیشتر یا تو قریبی دوستوں، عزیزوں کو لکھی ہیں یا ان لوگوں کو جنھوں نے حالی سے کسی قلمی نگارش یا اسی نوعیت کی کسی اور کاوش کا تقاضہ کیا تھا اور حالی کے لیے اپنی مجبوری کی تشریح کے بغیر معذرت کرنا ممکن نہ تھا۔ اپنے نواسہ کی بیماری اور علاج سے متعلق ایک خط میں عبدالرحیم خاں بیدل کو لکھتے ہیں:

''جس کے علاج کو دہلی گیا تھا اس کے صرع کے دورے تو رک گئے ہیں مگر جنون بڑھتا جاتا ہے۔ میرا ناک میں دم ہے نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ زندگی وبال ہوگئی ہے۔ یہ یقین

ہوگیا ہے کہ زیست کے برس دو برس جو باقی ہیں بہت بری طرح سے گزریں گے۔''26

دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

''مجھے اپنے ایک نوجوان نواسے کی بیماری نے جو صرع اور کسی قدر جنون میں مبتلا ہے بالکل پاگل بنا دیا ہے۔''27

صنف مکتوب نگاری میں مکتوب نگار کی جگہ جگہ تنقیدیں ملتی ہیں۔ حالی کے خطوط میں بھی تنقیدوں کا سرمایہ موجود ہے۔ جب مصلحت کی دراندازی کا کھٹکا نہ ہو اور نہ ادبی لغزشوں کا کوئی خوف، بلکہ اس وقت انسان جو کچھ بولتا ہے یا کہتا ہے وہ اس کی انفرادی رائے ہوتی ہے اور وہ سوچے بغیر اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے۔ وہ نہیں سوچتا کہ اس کی رائے سے اتفاق مخاطب کو ممکن ہے کہ نہیں۔ حالی نقد و نظر میں اپنا الگ مقام رکھتے تھے۔ بقول مولوی عبدالحق کہ اردو میں ادبی تنقید کی ابتدا حالی سے ہوئی۔ حالی جو رائے دیتے ہیں، بچی تلی، ذاتی اختلاف اور وقتی مصلحتوں سے بالاتر۔ ایک شاعر نے لکھنؤ کے بازار کی رونق پر مثنوی لکھی، اس پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''لکھنو کے ایک نامور شاعر نے اپنی مثنوی میں بازار کی رونق اور چہل پہل اس طرح بیان کی ہے کہ بازار میں آب گوہر کا چھڑکاؤ ہوتا ہے ظاہر ہے کہ اس بیان سے بجائے اس کے کہ بازار کی رونق ثابت ہو، یہ خیال ہوتا ہے کہ وہاں خاک اڑتی ہوگی۔ کیونکہ آب گوہر کا چھڑکاؤ خاک کو دبا نہیں سکتا۔''28

حالی کے خطوط میں نہ صرف تنقیدی آرا ملتی ہیں بلکہ خود مصنف کی تصانیف نیز تخلیقی سرگرمیوں کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً مولوی چراغ علی کی وفات پر انھوں نے فارسی میں ایک قطعہ لکھا۔ سرسید کی سوانح عمری ''حیات جاوید'' لکھی۔ سرسید کے مذہبی امور سے متعلق مضمون کالج کی میگزین میں شائع کرایا۔ ''حیات جاوید'' کی تصنیف پیش آنے والے واقعات کا حال بھی جا بجا ان خطوں میں ملتا ہے۔ اس طرح سے حالی کے خطوط کو ''حیات جاوید'' کے ابتدائی ماخذ میں شمار کر سکتے ہیں۔

''مکتوبات حالی'' میں اکثر خطوط اس وقت کے ہیں جب وہ سرسید کی سوانح عمری لکھ رہے تھے۔ اس کتاب کو لکھنے میں انھوں نے بے حد محنت، جانفشانی اور کاوش سے کام لیا۔ اپنی بیماری،

نواسہ کی بیماری، خانگی پریشانیوں کے باوجود''حیات جاوید'' کو مکمل کرنے کی کوشش کرتے رہے کتاب ''حیات جاوید'' شائع ہونے کے بعد لوگوں کی طرف سے بے اعتنائی ظاہر ہوئی تو مولانا الطاف حسین حالی کو اس کا قلق ہوا۔ ایک خط میں حبیب الرحمٰن شیروانی کو لکھتے ہیں:

''ڈیڑھ ماہ سے زیادہ عرصہ ہو چکا کہ''حیات جاوید'' کی جلدیں، تینوں قسم کی ڈیوٹی شاپ میں پہنچ گئیں۔ مجھے یقین تھا کہ آپ نے ضرور وہاں سے کتاب منگوالی ہوگی کیونکہ اگر مصنف قابل وقعت نہ تھا تو ہیرو بلا شبہ ایسا تھا کہ اس کی بائیوگرافی دیکھنے کا خاص کر آپ جیسے لوگوں کو دیکھنے کا ضرور مشتاق ہونا چاہیے تھا۔ مگر جہاں تک خیال کیا جاتا ہے مصنف کی بے وقعتی نے ہیرو کی بھی قدر گھٹادی ہے۔ جن لوگوں سے یہ امید تھی کہ اس کتاب کو منگوانے میں ایک دوسرے پر سبقت کریں گے ان کی طرف سے سرد مہری کے علاوہ میں نے اب تک کچھ نہیں دیکھا۔''29

ان کے ایک دست نے''حیات جاوید'' پر تبصرہ کیا اور کتاب کی بہت تعریف کی تو لکھتے ہیں:

''حیات جاوید' پر آپ کا ریویو دیکھا جو کلمات بتقاضائے محبت تصنیف اور مصنف کے حق میں بے اختیار آپ کے قلم سے ٹپک پڑے ہیں۔ اگر چہ میں اپنے تئیں ان کا مستحق نہیں سمجھتا لیکن بہر حال آپ کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔''30

مولانا حالی کے مزاج میں مزاح بھی تھا مگر بہت لطیف۔ ان کے خطوں میں کہیں ظرافت کا عنصر نمایاں ہے۔''حیات جاوید'' کی اشاعت کے بعد نواب محسن الملک کی طرف سے سرد مہری ظاہر ہوئی بعض شکایت آمیز جملے ان کے قلم سے نکل گئے مگر اس میں ظرافت نظر آتی ہے۔ حبیب الرحمٰن شیروانی کو'حیات جاوید' پر تبصرہ کی نسبت لکھتے ہیں:

''نواب محسن الملک بہادر نے بھی کچھ ریمارکس کرنے کا ارادہ کیا ہے مگر ان کا ارادہ ایسا ہی ہے جیسا ہر مسلمان حج کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔''31

حالی کے خانگی خطوط میں بھی کچھ مقامات ایسے آجاتے ہیں جہاں محبت اور لطافت ہم آغوش ہوجاتے ہیں۔ اپنی پوتی مشتاق فاطمہ کو لکھے خط کے کچھ جملے محبت، لطافت، ظرافت کا دلکش نمونہ

ہیں ایک خط میں لکھتے ہیں:

''مجھے امید ہے کہ وہاں رہنے سے تمہاری صحت اچھی ہو جائے گی، کیا اچھی بات ہو کہ تم وہاں سے ایسی موٹی تازی ہو کر آؤ کہ یہاں تمھیں کوئی پہچان نہ سکے اور تم قسمیں کھا کھا کر یقین دلاؤ کہ میں وہی ہوں۔''32

خواجہ الطاف حسین حالی کے بھتیجے کو ''اکسٹرا اسسٹنٹی'' کا عہدہ ملا۔ انھوں نے حالی کا شکریہ ادا کیا کہ یہ انھیں کی کوشش اور محبت کا نتیجہ ہے جب ان کے بھتیجے نے اپنے عہدے سے متعلق ٹیلی گرام بھیجا تو لکھتے ہیں:

''جو باتیں تم نے میری نسبت لکھی ہیں۔ یہ محسن تمہاری سعادت مندی اور کسی قدر تمہاری نادانی کی دلیل ہے۔ اگر بغرض محال میری کوشش کو تمہاری کامیابی میں دخل ہو بھی تو اس کو تقریباً ایسا ہی سمجھنا چاہیے جیسا کہ ایک باپ کی کوشش کو بیٹے کی کامیابی میں ہوتا ہے۔''33

دوسری جگہ اپنے بھتیجے کو مشورہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''والدہ صاحبہ کی یہ خواہش ہے کہ پہلی تنخواہ میں سے سو روپیہ اپنے خرچ کے واسطے رکھ کر ڈیڑھ سو روپیہ یہاں بھیج دو تو دھانیوں کو جو مدت سے آئے...دیا جائے اور مصلی اور مجلس اور منتیں جو مان رکھی ہیں سب پوری کی جائیں''۔34

حالی کے خطوط کا اسلوب سادہ، بے تکلف زبان اور صاف ستھرا ہے یہ خطوط بول چال اور روبرو گفتگو کا اندازہ رکھتے ہیں۔ سادہ بے تکلف زبان اور برجستہ انداز بیان کی وجہ سے بالمشافہ گفتگو کا گمان ہوتا ہے۔ انگریزی الفاظ بہت بے تکلفی اور بے تامل استعمال کرتے چلے جاتے ہیں۔ فارسی اشعار اور عربی فقرے بھی جگہ جگہ استعمال کرتے ہیں۔ جس سے ان کے ادبی مطالعے کی نشان دہی ہوتی ہے۔ حالی کے مکتوبات میں علی گڑھ دہلی کی ادبی مجلسوں اور باہمی بات چیت کا بھی عکس موجود ہے۔

مدرسۃ العلوم اور سرسید احمد خاں سے حالی کو بہت محبت تھی۔ حالی کی باطنی کیفیت، سرسید کی زندگی کی جھلکیاں، حالی کے زاویۂ نگاہ اور علی گڑھ سے ان کا ذہنی رشتہ ان کے مضامین کے علاوہ خطوط میں بھی سامنے آجاتا ہے۔ سرسید کے کردار کی پختگی ان کی اَنا، ان کا جذبۂ یقین، ان کی تگ

وواور دیگر مراحل خاص طور سے حالی کے خطوط کی زینت ہیں۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

''سید صاحب کو میں نے آج ہی خط لکھا ہے مگر تمہاری کوشش کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ وہ بڑی باتوں سے خوش ہونے والے نہیں۔ وہ تو جب تک قاضی القضات کا دیدار آنکھوں سے نہیں کر لیتے ہرگز ایمان نہیں لاتے۔ حیدر آباد کے حالات سے افسوس ہے کہ مدرسۃ العلوم کو اور سرسید کے منصوبوں کو سخت صدمہ پہنچا ہے۔ ادھر سید محمد جج چھوڑ بیٹھے ہیں۔ تعمیر برابر جاری ہے۔ سرسید اپنے نام سے قرض لے کر کام چلا رہے ہیں۔ دس پندرہ ہزار کے قریب قرض لے چکے ہیں۔''35

کسی تحریک میں شریک ہونا، اس کے لیے کام کرنا، اس کے منصوبہ کو عملی جامہ پہنانا الگ مسئلہ ہوتا ہے جہاں مختلف وجوہات کو دخل ہوتا ہے۔ کہیں ذاتی مفاد کا لالچ تو کہیں مشن کے اصولوں سے اپنے اصولوں کا اشتراک بھی۔ لیکن کسی تحریک کی تائید ظاہر و باطن سے کرنا اپنا سب کچھ لگا دینا کم ہی افراد کا عمل رہا ہے۔ حالی ان سراپا مخلص اور دیانت دار شخصیتوں میں سے تھے جو سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے سرسید کی خدمات کو سراہتے اور ان کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانا چاہتے تھے۔ ستمبر 1891 کو چندہ جمع کرنے کی غرض سے سرسید کے ساتھ بھوپال اور حیدر آباد گئے وہاں سے سجاد حسین کو لکھتے ہیں:

''سید صاحب کو توقع سے زیادہ کامیابی ہوئی ایک سوا اوپر بارہ ہزار بھوپال سے نقد ملے اور حضور نظام نے ایک ہزار روپیہ ماہوار کے علاوہ ماہنامہ سابق کے کہ وہ بھی اسی قدر تھا مقرر فرما دیا اور صرف ایک صوبہ سے 25 ہزار نقد وصول ہوا ہے۔''36

سرسید اور حالی کے آپس میں گہرے تعلق تھے اس کا اندازہ خطوط کے مطالعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ حالی کے دل میں سرسید کے لیے عقیدت اور محبت اس قدر گھل مل گئی تھی کہ اسے الگ الگ کر کے دیکھنا مشکل ہے۔ دونوں میں اگر فرق ہے تو صرف طرز و تیور کا مقصد کا نہیں۔ انیسویں صدی کی سیاست تعلیمی ومعاشرتی اصلاح کی سیاست تھی۔ مگر بیسویں صدی کے آغاز میں مسلمان عملی طور پر بین الاقوامی اسلامی سیاست سے لو لگا چکے تھے۔ اس آخری دور میں بھی حالی کا دل قوم کے دل کے ساتھ دھڑک رہا تھا۔ حالی بے حد محتاط مزاج کے انسان تھے سیاسی ہنگامہ آرائی سے

ان کی طبیعت کو زیادہ مناسبت نہیں تھی۔ حالی کی عمر بیس سال تھی جب 1857 کا ہنگامہ برپا ہوا۔ سر سید کے مقابلے میں ان کے بعض تجربات کم تھے اور بعض زیادہ۔ سرسید نے جنگ بالاکوٹ 1831 کا حسرت ناک انجام دیکھا تھا اور اس سے پیدا شدہ حالات کا مقابلہ کیا تھا۔ حالی نے ابھی شعور کی آنکھیں نہیں کھولی تھیں۔ سرسید اسلامی ممالک کے جن تباہ کن حالات پر اپنے گہرے تاثرات کا اظہار کرتے تھے اس کے عبرت ناک نتائج حالی کے آخری زمانے میں سامنے آئے۔ ایک خط میں عبدالحق کے مضمون کی تعریف کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"مگر برٹش فارن پالیسی پر جو اس میں نوک جھونک کی گئی ہے وہ سراسر خلاف مصلحت ہے۔ اگر آپ کی یہی درست گفتاری رہی تو للہ آپ اس سلسلے کو چھیڑنے کی تکلیف گوارا نہ فرمائیں۔"37

ایک دوسرے خط کے مطالعے سے حالی کے سیاسی شعور کی شدت کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ 12/اکتوبر 1912 کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"ترکی کی خبریں جو آج کل آرہی ہیں انھوں نے بالکل کمر توڑ دی ہے۔ ایران اور مراکو کی تو فاتحہ پڑھ چکے تھے۔ اب ترکی بھی بظاہر خیر معلوم نہیں ہوتی۔"38

مولوی عبدالحق کے نام جو خطوط حالی نے لکھے ہیں، ان میں مختلف اور متنوع مضامین ملتے ہیں۔ حالی ان خطوط میں کہیں دوست، بزرگ اور کہیں ناصحِ مشفق کی حیثیت سے نظر آتے ہیں۔ ان خطوط میں راز کی باتیں کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔ کبھی اپنے مسلک کی وضاحت کرتے ہیں کہیں عبدالحق کو زمانے کی سرد و گرم ہواؤں سے آشنا کرتے ہیں۔

اگر کوئی ایسی تصنیف حالی کے سامنے آجاتی جس سے فرقہ وارانہ جذبات یا مذہبی منافرت پھیلنے کا ڈر ہوتا تو پریشان ہو جاتے تھے۔ ان کے ایک ہم وطن برہمن نے کتاب "خاتونِ ہند" لکھی اور سراسر تنگ نظر اور تعصب سے کام لیا۔ عبدالحق سے ایک خط میں ریویو لکھنے کے لیے کہتے ہیں، لکھتے ہیں:

"ریویو میں اس بات پر زور دینا چاہیے کہ جو لوگ ہندو مسلمانوں میں تفرقہ اور پھوٹ ڈالنے والی کتابیں لکھتے ہیں۔ وہ ہندوستان کے سخت دشمن ہیں۔ خواہ وہ ہندو ہوں یا

مسلمان۔ برہموں ہوں یا آریہ۔''39

''مکتوبات حالی'' میں بیشتر خطوط ایسے ہیں جن میں کسی نہ کسی طرح سے سرسید اور مدرستہ العلوم کا ذکر اور اس کی فکر کا اظہار ملتا ہے۔

حکم چند نیر نے اپنے مضمون ''مولانا حالی کے چار نادر غیر مطبوعہ خط 40 میں ذکر کیا ہے کہ ایم ہندی انسٹی ٹیوٹ آگرہ کی لائبریری میں ایک بکس، پنڈت پدم سنگھ شرما 41 کے نام خط سے بھرا ہوا ہے۔ اس میں اردو میں چالیس خطوط ہیں۔ حکم چند نیر لکھتے ہیں:

''اردو کے ان چالیس خطوط میں چار خطوط خواجہ الطاف حسین حالی کے اکتیس خطوط اکبرالہ آبادی کے اور تیس خط منشی سورج نرائن مہر دہلوی کے ہیں۔''42

پنڈت پدم سنگھ شرما کا کتب خانہ کے ایم منشی ہندی انسٹی ٹیوٹ آگرہ میں محفوظ ہے جس میں ہندی اور سنسکرت کی ہزاروں کتابوں کے ساتھ فارسی کی کتابوں کا ذخیرہ موجود ہے۔ پنڈت پدم سنگھ کا انتقال 17/ اپریل 1932ء کو ہوا۔ مولانا الطاف حسین حالی سے ان کی خط کتابت ہوتی تھی۔ بقول حکم چند نیر:

''شرماجی کے نام خواجہ الطاف حسین حالی کے چار خطوط محفوظ ہیں۔ تین پوسٹ کارڈ اور ایک لفافہ ہے۔ یہ خطوط غیر مطبوعہ ہیں۔''43

حکم چند نیر نے اپنے مضمون ''مولانا حالی کے چار نادر غیر مطبوعہ خطوط پنڈت پدم سنگھ کے نام' میں حالی کے ان چار خطوں کا متن درج کیا ہے جو پنڈت پدم سنگھ کے نام ہیں۔ ان میں پہلا 15/ جولائی 1905 کا ہے، جس میں حالی ''بیوہ کی مناجات'' اور دیگر مضامین اور منظومات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''نہایت خوشی کی بات ہے کہ بیوہ کی مناجات، سنسکرت میں نظم کی گئی ہے۔ آپ شوق سے اس کو شائع کرائیں اور میں نہایت ممنون ہوں گا اگر ایک کاپی اس کی مجھے بھی عنایت ہوگی۔ ''مضامین حالی'' میں نے چھپوائے۔ میرے دوست مولوی وحید الدین

صاحب (سلیم) نے علی گڑھ گزٹ وغیرہ اخباروں اور رسالوں سے ڈھونڈ نکال کر یہ مضمون چھپوائے ہیں۔"44

خط نمبر دو میں بھی مجالس النسا اور نظم ''چپ کی داد'' کا ذکر ہے۔ یہ خط 14/ مارچ 1907 کا لکھا ہوا ہے تیسرا خط 18/اگست 1908 کا ہے جس میں مناجات پر ریمارکس اور سنسکرت، ترجمہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مجھے اس بات کی دریافت ہونے سے بے انتہا خوشی ہوئی کہ پنڈت بھیم سین جی نے مناجات بیوہ کو بہت پسند کیا اور اس کو اس قابل سمجھا کہ سنسکرت میں اس کا منظوم ترجمہ کیا جائے جو آپ نے اپنے رسالے میں نظم مذکور پر ریمارکس فرمائے ہیں۔ ان کا بھی میں دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں نہایت ممنون ہوں گا اگر آپ مہربانی فرما کر رسالہ پروپکاری کے پرچے جب تک اس میں سنسکرت کا منظوم ترجمہ چھپتا رہے، میرے پاس بھیجتے رہیں گے۔ میں ان تمام پرچوں کو جمع کر کے ایک جلد میں پانی پت کی لائبریری میں جہاں سنسکرت کی کتابیں بھی داخل کی گئی ہیں۔ داخل کروں گا۔''45

چوتھا خط جس کا متن درج ہے اس میں ہندی شاعری بہاری ست سئی کے دوہے اور اردو اشعار کے متعلق اپنی رائے دیتے ہیں۔ اس خط کو بھی حکم چند نیر نے غیر مطبوعہ خطوط میں شامل کیا ہے لیکن یہ ادبی خط مجموعہ ''مکاتیب حالی'' کے صفحہ نمبر اکیاسی اور بیاسی پر درج ہے۔ مولانا کے اس خط کی تمہید مولوی عبدالحق نے لکھی ہے۔ مجموعہ ''مکاتیب حالی'' اگست 1950 میں ادبی پریس کراچی سے شائع ہوا اور اس کے مرتب شیخ محمد اسماعیل پانی پتی ہیں اس لیے اس خط کو غیر مطبوعہ نہیں کہا جا سکتا۔

حالی کے خطوط میں شرافت، ہمدردی اور خلوص حالی پر ہی ختم ہوتی نظر آتی ہے۔ مولوی عبدالحق، مولانا ظفر علی خاں، مولوی یحیٰ تنہا اور مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے نام جو خطوط ہیں۔ وہ سچی محبت اور باہمی خلوص کے مظہر ہیں۔ حالی کے خطوط مشرقی وضع داری اور شفقت کے دل آویز نمونے ہیں۔ حالی کے خطوط محض ضرورت کی بنا پر لکھے گئے ہیں۔ خطوط کا مقصد آرائش زبان، نہ تجدید ملاقات، نہ جذبات کے اتار چڑھاؤ دکھانا اس لیے حالی کے خطوط میں انسانی زندگی

کی نیرنگیاں اور بوقلمونیاں نظر نہیں آتیں۔ حالی کے دوسرے کارناموں کے مقابلے میں ان کے خطوط جوش وخروش اور شدت جذبات سے خالی ہیں۔ ان میں وہ چمک دمک اور سرور نہیں ہے جس سے تھوڑی دیر کے لیے دنیائے آب وگل کی کلفتیں اور ہوجاتیں۔ حالی کے خطوط میں صاف اور سادگی سے کام کی باتیں ہیں، ملکی وقومی مسائل ہیں اور ہزاروں کا احترام ہے کہیں پر بے تکلف مشورہ ہے کہیں پر زمانے کے نشیب وفراز، انسانی فطرت اور دنیا کی رفتار پر دو چار سطریں لکھ دی ہیں۔ قومی اتحاد، ضبط وتحمل، رواداری، ایثار وکرم اور باہمی محبت کی باتیں وغیرہ خطوطِ حالی کی خصوصیات ہیں۔

''مکاتیب حالی'' میں ایسے خطوط بھی ہیں جن میں بعض علمی یا ادبی یا تاریخی نکات بیان کیے ہیں۔ کچھ لوگوں کو ان کی ادبی غلطیاں بتائی ہیں اور متنازعہ فیہ مسائل کو بھی حل کیا ہے جو اصحاب فن شعر میں ان کے شاگرد تھے ان کو بھی مشورہ سخن دیا ہے۔ پروفیسر حمید احمد خاں حالی کے خطوط پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''مولانا حالی کی ذاتی دردمندی اور اخلاص تو قدرتاً یہاں بھی اسی طرح موجود ہیں، جس طرح ان تمام مضامین میں جو انھوں نے خاص طور پر بغرضِ اشاعت لکھے۔ مزید لطف اس جگہ پر یہ ہے کہ ان متفرق خطوں میں تعمیر قوم سے متعلق حالی کا مضطربانہ جذبہ جابجا چھلکا پڑتا ہے اور صاف ظاہر ہے کہ اس معاملے میں ان کے خانگی خط بھی مستثنیٰ نہیں ہیں۔ حالی کے خطوط کا مطالعہ یہ بھی واضح کردیتا ہے کہ حالی نے جس سیدھی اور بے تکلف زبان میں اپنے ذاتی خط لکھے، وہی زبان انھوں نے اپنی علمی اور رفاہی تحریروں میں استعمال کی۔'' 46

حواشی:

1. الطاف حسین حالی۔ حنیف نقوی۔ غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی۔ ص. 197
2. یادگار حالی، صالحہ عابد حسین، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، باردوم، ستمبر 1949، ص 259
3. مکاتیب حالی، پیش لفظ، مرتبہ اسماعیل پانی پتی، ص9، ادبی پریس کراچی، 1950
4. مکتوبات حالی، جلد دوم، مرتبہ سجاد حسین، خط بنام، حافظ سعود اکبر عثمانی، جنوری 1886
5. ایضاً، خط بنام تصدق حسین، 3 فروری 1894
6. ایضاً، خط بنام تصدق حسین، 30 فروری 1894

7 مکاتیب حالی، مرتبہ اسماعیل پانی پتی، ص 62-61، ادبی پریس کراچی، اگست 1950

8 تنقیدات عبدالحق، ڈاکٹر عبدالحق، ص 104، خواجہ پرنٹنگ پریس دہلی 1956ء

9 اہلیہ خواجہ غلام الثقلین

10 داستان تاریخ اردو، حامد حسن قادری، ص 593

11 ایضاً ایضاً ایضاً

12 مکتوبات حالی، جلد اول، ص 364

13 ارمغان حالی، ص 138

14 حالی کی اردو نثر نگاری، سید عبداللہ، ص 627-626

15 تحریک آزادی میں اردو کا حصہ، معین الدین عقیل، ص 793-792، انجمن پریس، اشاعت اول 1974

16 خط بنام مولانا شبلی، مکاتیب حالی، ص 40

17 ایضاً، ص 42

18 ادبی دنیا، ص 31-30، خط بنام محسن الملک، ص 31-30

19 خط بنام خواجہ اخلاق حسین، مکاتیب حالی، ص 23

20 مکاتیب حالی، ص 38

21 ایضاً، ص 77

22 ایضاً، ص 78

23 مکاتیب حالی، ص 36-35

24 ایضاً، ص 85-84

25 ایضاً، ص 23

26 ارمغان حالی، مقدمہ وحواشی، پروفیسر حمید احمد خاں، ص 50، دین محمد پریس، لاہور 1971

27 مکتوبات حالی، جلد اول، ص 112

28 مکاتیب حالی، ص 82، اشارہ ہے آفتاب الدولہ خواجہ اسد علی لکھنوی کی مثنوی 'طلسم الفت' کی طرف دو اشعار اس طرح:

وہ مصفا سڑک وہ اس کا جماؤ آب گوہر کا چار سو، چھڑکاؤ

رات دن جمگھٹا ہے میلہ ہے　　　مہر دمہ کا کٹورا بجتا ہے

29 تنقیدات، عبدالحق، ص93

30 ایضاً،ص99

31 خط بنام حبیب الرحمٰن خاں شیروانی،نقوش مکاتیب نمبر،ص175

32 خط بنام مشتاق فاطمہ اہلیہ غلام الثقلین، داستان تاریخ اردو، ص593

33 تنقیدات، عبدالحق، ص100-99

35 مکاتیب حالی، 29 جنوری1893

35 فروغ اردو، حالی نمبر، جون 1955ء حصہ دوم، ص464

36 ایضاً،ص466

37 مکتوبات حالی، حصہ اول، خط بنام عبدالحق، 23/اگست 1908، ص 77

38 ایضاً، ایضاً،ص108

39 ایضاً،ص84

40 رسالہ فکرونظر، حالی نمبر،ص204، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، اکتوبر 1991ء

41 پنڈت پدم سنگھ ہندی کے ادیب ونقاداور شاعر تھے۔انھیں ہندی، عربی، سنسکرت، اردو، فارسی اورانگریزی پر یکساں قدرت حاصل تھی۔

42 رسالہ فکرونظر، حالی نمبر، اکتوبر 1991ء،ص25

43 ایضاً،ص212

44 ایضاً،ص212

45 ایضاً،ص213

46 ارمغان حالی،ص122

✿✿✿

آفتاب عالم آروی

حالی اور لفظ ''تنقید'' کی تحقیق

ادب کے اصول ونظریات ہمیشہ لسانی معاشرہ کی تہذیبی ترجیحات سے نمو کرتے ہیں۔مزید یہ کہ کوئی اصول، نظریہ یا موقف ادب میں اچانک ظہور نہیں کرتا بلکہ ایک مکمل تصور کے مرتبہ کو پہنچنے سے پہلے وہ ارتقا اور تنقید کے کئی مراحل سے گذرتا ہے۔اس لیے ادب میں کسی تصور کے متعلق یہ دعویٰ کہ یہ تصور پہلی مرتبہ کسی مخصوص ادیب کے یہاں یا کسی خاص متن میں نظر آتا ہے، بیشتر صحیح ثابت نہیں ہوتا۔اول تو ممکن ہے کہ ٹھیک یہی لفظ یا تصور اس سے پہلے کے متون میں مل جائے یا اگر ایسا نہ ہو تو اس کا قوی امکان ہے کہ اس نئے تصور کی ابتدائی شکل اس سے پہلے کے ایک سے زیادہ متون میں موجود ہو۔

اس کی ایک مثال لفظ ''تنقید'' کا اردو ادب میں استعمال ہے۔لفظ ''تنقید'' کے وجود، تاریخ اور تحقیق کا سوال اتنا اہم نہیں جتنا کہ خود اس لفظ کے معنی ومطالب کا ہے۔لیکن اس کی اہمیت اس وقت بڑھ جاتی ہے جب اس لفظ کے اردو میں پہلی مرتبہ استعمال کے متعلق سوال کھڑا ہوتا ہے۔

''تنقید'' اردو والوں کا ایجاد کردہ لفظ ہے۔عربی و فارسی میں اس کے لیے نقد، انتقاد اور مناقدہ کے الفاظ مستعمل ہیں۔عام طور پر ''تنقید'' کا لفظ نکتہ چینی اور کسی چیز یا شخص میں معائب کی تلاش کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔لیکن جب اس لفظ کا استعمال شعر وادب کے تعلق سے ہوتا ہے تو یہ صرف تنقید نہیں بلکہ ''ادبی تنقید'' کہلاتی ہے۔ادبی تنقید کسی ادب پارے یا فن پارے میں محاسن ومعائب ی تلاش ونشاندہی کا فن ہے۔یعنی اس میں نہ صرف خامیاں بلکہ خوبیوں کی بھی نشاندہی کی جاتی ہے۔یہ تنقید یا ادبی تنقید کا عام مفہوم ہے۔اس کے بعد نظری اور عملی تنقید کی بحث شروع ہوتی ہے۔

اب ایک مسئلہ اردو میں لفظ ''تنقید'' کے رواج کا ہے یعنی یہ لفظ اردو میں پہلی بار کب، کہاں

اور کس نے استعمال کیا؟ یہ بات ذہن نشین رہے کہ لفظ ''تنقید'' کا استعمال ایک الگ چیز ہے اور اس کا اپنے ادبی مفہوم میں ہونا یا نہ ہونا ایک الگ مسئلہ ہے۔ اس سلسلے میں یہاں اردو کے دو معروف ان کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے جنھوں نے اس مسئلے کی جانب ہماری توجہ مبذول کرائی۔ ان میں ایک کا تعلق ہندوستان اور دوسرے کا پاکستان سے ہے۔

اردو ادب میں جناب شمس الرحمٰن فاروقی کی حیثیت بجا طور پر ایک دانشور اور بہت محترم نقاد کی ہے۔ انھوں نے نہ صرف اردو تنقید بلکہ زبان و قواعد، عروض و بلاغت اور مطالعہ داستان میں قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ تفہیم غالب اور شرح میر کے سلسلے میں ان کے طریق کار کو کسی دور میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اردو تنقید کی تاریخ میں شمس الرحمٰن فاروقی کی تحریروں سے ایک بالکل نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ فاروقی صاحب اپنی کتاب ''تنقیدی افکار'' میں لفظ ''تنقید'' کی تحقیق کے متعلق ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''تنقید کا لفظ ہمارے یہاں سب سے پہلے مہدی افادی نے 1910 میں استعمال کیا۔ (تنقیدی افکار، ص 247، NCPUL، 2004)

فاروقی صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ مہدی افادی نے ''تنقید'' کا لفظ پہلی بار کہاں استعمال کیا؟ خیر یہ ہمارا مسئلہ بھی نہیں۔ ہمارا مسئلہ تو یہ ہے کہ لفظ ''تنقید'' اردو میں پہلی مرتبہ کب استعمال ہوا جو فاروقی کے مطابق 1910 میں ہوا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اردو میں لفظ ''تنقید'' کا وجود 1910 سے پہلے نہیں ملتا۔ اس بات کی تصدیق فاروقی صاحب کے اس جملے سے بھی ہو جاتی ہے:

> ''آزاد نے آبِ حیات (1880) کو جگہ جگہ ''تذکرہ'' کہا ہے۔۔۔ پوری کتاب میں تنقید یا انتقاد یا نقاد جیسا کوئی لفظ نہیں استعمال ہوا ہے۔'' (ایضاً ص 247)

یہ تو تھا آبِ حیات کا مسئلہ جس کی صنفی حیثیت تنقید کی نہیں تذکرے کی ہے، فاروقی صاحب نے اردو میں پہلی باقاعدہ تنقیدی تصنیف ''مقدمہ شعر و شاعری'' (1893) میں بھی اس لفظ کے عدم وجود کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''مقدمہ شعر و شاعری میں بھی تنقید، انتقاد یا نقاد جیسا کوئی لفظ نہیں برتا گیا ہے۔ ''مقدمہ''

کے چار سال بعد حالی نے جب ''یادگار غالب'' لکھی (1897) تو اس میں غالب کی نظم و نثر کے تنقیدی محاکے پر انھوں نے ''ریویو'' (Review) اور ''ریمارک'' (Remark) جیسے عنوانات قائم کیے۔'' (ایضاً ص 247)

فاروقی کی اس تحقیق سے ظاہر ہے کہ لفظ ''تنقید'' کا وجود نہ آزاد کے یہاں اور نہ ہی حالی اور امداد امام اثر کے یہاں۔ وہ مذکورہ ادیبوں کے یہاں اس لفظ کی عدم موجودگی کے سبب یہ نتیجہ بھی نکالتے ہیں کہ:

''ان (آزاد، حالی، اثر) کے یہاں 'نقد' اور اس سے مشتق اصطلاحات کا عدم استعمال اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ خود اپنی نظر میں نقاد نہ تھے، مورخ، مصلح، مبلغ، سوانح نگار کچھ بھی رہے ہوں۔'' (ایضاً ص 247)

اس سلسلے کی دوسری مثال اردو کے مابعد جدید نقاد ڈاکٹر ناصر عباس نیر کی پی ایچ ڈی تھیسس بعنوان ''اردو تنقید پر مغربی تنقید کے اثرات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ'' ہے جو بلا شبہ اردو کے چند بہترین مقالوں میں سے ایک ہے۔ عام طور پر پی ایچ ڈی کے مقالے جو کتابی شکل میں نہ چھپے ہوں، حوالے یا سند کی حیثیت نہیں رکھتے، لیکن جب ایک نقاد اپنی تحریروں کے سبب عام لوگوں کی توجہ اپنی طرف منعطف کر لیتا ہے تو اس کی ہر تحریر غور سے پڑھی جانے لگتی ہے۔ ناصر عباس نیر اپنے اس مقالے میں شبلی کی تنقید پر لکھتے ہوئے لفظ ''تنقید'' کا مسئلہ بھی اٹھاتے ہیں۔ حالانکہ وہ شمس الرحمٰن فاروقی کی طرح اس مسئلے پر تفصیل سے گریز کرتے ہیں لیکن ان سے دو قدم آگے کی بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"شبلی کے یہاں تنقید کا لفظ، سیرت النبی کے دیباچے میں ملتا ہے مگر تنقیص کے مفہوم میں۔" (ص 99)

ناصر عباس نیر کا یہ خیال شبلی کے بارے میں ہے، حالی کے متعلق ان کی کیا رائے ہے۔ اس کا ذکر نہیں کرتے۔ علامہ شبلی نے سیرت النبی کا دیباچہ غالباً 1912 یا 1913 میں لکھا۔ جو سیرت النبی، جلد اول کے ساتھ 1918 میں نامی پریس کانپور سے چھپ کر اعظم گڑھ سے شائع ہوا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ڈاکٹر ناصر عباس کے نزدیک 1912 سے قبل شبلی کے یہاں لفظ ''تنقید'' کا کوئی وجود نہیں ملتا اور جب ملا بھی تو اپنے قدیم لغوی معنی کمیاں یا خامیاں تلاش کرنے کے معنی میں۔

ناصر عباس نیر کا یہ خیال کسی حد تک درست قرار دیا جا سکتا ہے کہ:

''۔۔۔۔اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ تنقید نگاری اس زمانے میں اتنی اہم سرگرمی نہیں تھی، جتنی تاریخ تھی۔ مثلاً یہی دیکھئے مقدمہ شعر و شاعری، موازنہ انیس و دبیر، شعرالعجم، کاشف الحقائق کے لیے تنقید کا لفظ ہی استعمال نہیں کیا گیا۔'' (ایضاً ص 99)

ناصر عباس نیر سے بہت پہلے جناب شمس الرحمٰن فاروقی اپنا یہ خیال آزاد' حالی' اثر اور شبلی کے متعلق ظاہر کر چکے ہیں۔

''چونکہ ان کی تحریروں میں ادب کی تخلیق کے بارے میں نظری اور عملی باتیں کثرت سے تھیں۔ لہٰذا ہم نے ان کے پورے پیغام کو ادبی تنقید قرار دیا۔۔۔یعنی ہمارے یہاں تنقید اور نقاد کی با قاعدہ پیدائش کے پہلے ہی تنقید اور تنقید نگار' ادبی رہنما، ہدایت دہندہ اور اصلاح کوش استاد کی حیثیت سے قائم ہو چکے تھے۔'' (تنقیدی افکار' ص 248)

اردو میں لفظ ''تنقید'' کے وجود کے سلسلے میں جناب شمس الرحمٰن فاروقی اور ڈاکٹر ناصر عباس نیر کے ان مشاہدات کے بعد ''تنقید'' کی تحقیق ایک دلچسپ مرحلے میں داخل ہو جاتی ہے۔

لفظ ''تنقید'' کا استعمال اردو کی پہلی باقاعدہ تنقیدی تصنیف حالی کی ''مقدمہ شعر وشاعری'' 1893 میں بھی ہے اور شبلی کی شہرہ آفاق تصنیف ''شعرالعجم'' (جلد چہارم 1912) میں بھی اور ان دونوں کے درمیان لکھی جانے والی تاریخی تصنیف ''الفاروق'' (1898) میں بھی لفظ تنقید متعدد بار آیا ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ''تنقید'' نہ صرف لفظی بلکہ اصطلاحی معنی و مفہوم میں ہے۔ سب سے پہلی مثال تنقید کی سب سے پہلی کتاب ''مقدمہ شعر و شاعری'' سے سنئے۔

''اگر چہ اردو شاعری کی حقیقت ظاہر کرنے کے لئے اس بات کی نہایت ضرورت تھی کہ مشہور اور مسلم الثبوت شاعروں کے کلام پر اصراحۃً نکتہ چینی کی جائے۔ کیونکہ عمارت کا بوداپن جیسا کہ بنیاد کی کمزوری سے ثابت ہوتا ہے ایسا اور کسی چیز سے ثابت نہیں ہوتا۔ مگر صرف اس خیال سے کہ ہمارے ہم وطن ابھی اعتراض سننے کے عادی نہیں ہیں۔ بلکہ تنقید کو تنقص سمجھتے ہیں۔ جہاں تک ہو سکا ہے اس مضمون میں کسی خاص شاعر کے کلام پر

کوئی گرفت یا اعتراض اس طرح نہیں کیا گیا جو خاص اس کے کلام سے خصوصیت رکھتا ہو۔'' (مقدمہ شعروشاعری از حالی، مرتبہ وحید قریشی، ص 166، علی گڑھ 2002)

اس اقتباس میں نہ صرف لفظ ''تنقید'' کا استعمال ہوا ہے بلکہ تنقید اپنے پورے معنی و مفہوم کے ساتھ موجود ہے۔ بے شک لفظ ''تنقید'' سے پہلے ''نکتہ چینی'' کا بھی ذکر آیا ہے لیکن وہ اس مفہوم میں ہے کہ عوام کسی کے کلام کی خامیاں بیان کرنے کو نکتہ چینی تصور کرتے ہیں لیکن ان کا دوسرا جملہ کہ ''ہمارے ہم وطن تنقید کو تنقیص سمجھتے ہیں'' تنقید کے اصطلاحی مفہوم کو پوری طرح روشن کر دیتا ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حالی کا ذہن تنقید کے معنی و مطالب کے متعلق بالکل صاف ہے۔ جب حالی اس سے اچھی طرح باخبر/واقف ہیں کہ تنقید وہ ہے جو تنقیص نہیں ہے، اس بات کھلا ثبوت ہے کہ وہ شاعری کی ماہیئت خصوصیات اور اقسام کے متعلق لکھی گئی اپنی تحریر کو تنقید سمجھتے ہیں تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ خود اپنی نظر میں ''نقاد'' نہ تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ انھوں کبھی اس کا اظہار نہیں کیا۔

اس سلسلے کی دوسری مثال شبلی نعمانی کی تاریخی تصنیف ''الفاروق'' (1898) ہے جس کی تمہید میں شبلی نے روایت اور درایت کے بیان میں متعدد بار لفظ ''تنقید'' کا استعمال کیا ہے اور یہاں بھی تنقید سے ان کا مفہوم واضح ہے مثلاً درایت کے سلسلے میں یہ مثالیں ملاحظہ ہوں۔

> ''درایت سے یہ مراد ہے کہ اصول عقلی سے واقعہ کی تنقید کی جائے۔ (الفاروق، حصہ اول، ص 12، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، 1993)

> ''درایت کے اصول بھی اگر چہ موجود تھے، چنانچہ ابن حزم، ابن قیم، خطابی، ابن عبدالبر نے متعدد روایتوں کی تنقید میں اصولوں سے کام لیا ہے لیکن انصاف یہ ہے کہ اس فن کو جس قدر ترقی ہونی چاہیے تھی نہیں ہوئی۔'' (ایضاً ص 12)

> ''واقعات کی تحقیق و تنقید کے لیے روایت کے اصول سے بہت بڑی مدد مل سکتی ہے۔'' (ایضاً ص 14)

> ''روایتیں جو تاریخی ہونے کے ساتھ مذہبی حیثیت بھی رکھتی ہیں۔ ان میں یہ خصوصیت صاف محسوس ہوتی ہے کہ جس قدر ان میں تنقید ہوتی گئی، اسی قدر مشکوک باتیں کم ہوتی گئی ہیں۔'' (ایضاً 16)

اصول عقلی سے واقعہ کی تنقید، روایتوں کی تنقید میں درایت کے اصولوں کی کارفرمائی، واقعات کی تحقیق وتنقید میں اصولِ درایت سے مدد لینا اور تنقید کی وجہ سے مشتبہ اور مشکوک باتوں میں کمی، واضح طور پر گواہی دیتے ہیں کہ شبلی کے ذہن میں تنقید کا مفہوم اور اس کے امتیازات بالکل روشن تھے۔

''شعرالعجم'' (چار جلد) کی تصنیف پانچ سال کے طویل عرصے پر محیط ہے۔ علامہ شبلی نے اسے 1907 سے 1912 کے درمیان مکمل کیا۔ شعرالعجم کی پانچویں جلد، سیرت النبی، جد اول کی پہلی اشاعت 1918 کے بعد شائع ہوئی۔ اسے سید سلیمان ندوی نے شبلی کی وفات کے آٹھ سال بعد 1922ء میں شائع کیا۔ شبلی کے ایک خط سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے شعرالعجم لکھنے کی ابتدا ''موازنہ انیس و دبیر لکھنے کے دوران ہی کردی تھی۔ شبلی نے موازنہ انیس و دبیر 1906 میں مکمل کی۔

لفظ ''تنقید'' کی تیسری مثال شبلی کی شعرالعجم، جلد چہارم پہلی بار 1912ء (علی گڑھ اور آگرے سے) میں شائع ہوئی۔ اس کے پہلے ہی صفحے پر شبلی نے دومرتبہ اور تخیل کے بیان میں ایک جگہ لفظ ''تنقید'' کا استعمال کیا ہے اور اسے محض اتفاق ہی کہیے کہ یہاں بھی ''تنقید'' تنقیص کے معنی میں نہیں ہے۔ شبلی لکھتے ہیں:

> ''شعرالعجم کا یہ چوتھا یعنی اخیر حصہ ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اگلے تینوں حصے اس حصہ کے دیباچے اور تمہید تھے، اس حصے میں ایران کی عام شاعری پر تنقید ہے، اس لیے جو بحثیں اگلے حصوں میں ناتمام رہ گئی تھیں، ان کو اب تفصیل سے لکھتا ہوں۔'' (شعرالعجم، جلد چہارم، ص3، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، 2013)

اس کے بعد شبلی اس حصے کو (شاعری کی) تین فصلوں میں تقسیم کرتے ہیں اور تیسرے باب کا عنوان ''تقریظ وتنقید'' (ایضاً ص2) تجویز کرتے ہیں۔ لیکن اس باب میں کے آغاز میں ''فارسی شاعری پر اجمالی ریویو'' کا عنوان قائم کرتے ہیں۔ شروع کی تحریر سے ہی یہ حقیقت عیاں ہوجاتی ہے کہ شبلی تنقید یا ریویو کو تنقیص کے معنی میں استعمال نہیں کرتے۔ لکھتے ہیں:

> ''فارسی شاعری کے محاسن ومثالب سے بحث کرنے کے لیے عرب کی شاعری کو پیش نظر

رکھنا اور اس سے موازنہ کرنا چاہیے، جس سے نہایت وضاحت کے ساتھ نظر آئے گا کہ فارسی شاعری میں کیا کیا نقص اور کیا کیا محاسن ہیں۔'' (ایضاً 173)

شبلی کی شعر العجم میں لفظ ''تنقید'' کی تیسری مثال جو تخیل کے بیان میں موجود ہے، ملاحظہ ہو:

''تخیل مسلم اور طے شدہ باتوں کو سرسری نظر سے نہیں دیکھتی بلکہ دوبارہ ان پر تنقید کی نظر ڈالتی ہے اور بات میں بات پیدا کرتی ہے۔'' (ایضاً ص 29)

ڈاکٹر ناصر عباس نیر نے بھی اس اقتباس کو اسی مضمون میں نقل کیا ہے جہاں وہ یہ کہتے ہیں کہ شبلی کے یہاں تنقید کا لفظ سیرت النبی کے دیباچے میں ملتا ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ وہ سیرت النبی سے پہلے لکھی گئی کتاب شعر العجم، جلد چہارم کا ذکر نہیں کرتے حالانکہ وہ اقتباس نقل کرتے ہیں جس میں تنقید کا لفظ موجود ہے اور تنقیص کے معنی میں بھی نہیں ہے۔

اس پورے محاکمے کے بعد یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ان مذکورہ کتابوں میں لفظ ''تنقید'' نہ صرف اپنے لغوی بلکہ اصطلاحی معنی و مفہوم میں بھی کئی جگہ موجود ہے۔

لفظ ''تنقید'' کی یہ تخلیق صرف بیس سال کے عرصے پر محیط ہے۔ اگر ''آب حیات'' کو چھوڑ دیا جائے تو ''کاشف الحقائق'' (1897) اور موازنہ انیس و دبیر'' (1906) کے مباحث خالص تنقیدی ہیں۔ اس کے علاوہ حالی کی ''یادگار غالب'' (1897) بھی اردو میں عملی تنقید کی پہلی عمدہ مثال ہے۔ لفظ ''تنقید'' کے تعلق سے ان تصانیف کا اگر بہ غور مطالعہ کیا جائے تو قوی امکان ہے کہ نقد، انتقاد یا تنقید جیسے الفاظ کی مزید مثالیں سامنے آجائیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس عہد کے دوسرے ریویو/تبصرہ نگاروں یا ریمارکس لکھنے والوں کے یہاں ''تنقید'' اس مفہوم میں مل جائے، جس میں ہم اب اس لفظ کو استعمال کرتے ہیں۔ بہر حال اردو کی پہلی تنقیدی کتاب حالی کی ''مقدمہ شعر و شاعری'' (1893) میں لفظ ''تنقید'' کی اس تحقیق سے اس لفظ کی تاریخ میں بیس سال کا اضافہ تو ہو ہی گیا۔

✿✿✿

ادبی سرگرمیاں

27 ردسمبر کو مرزا غالب کے 216 ویں یوم ولادت کا جلسہ:

نئی دہلی، غالب اکیڈمی ہر سال مرزا غالب کے یوم ولادت کے موقع پر 27 دسمبر کو ایک جلسے کا اہتمام کرتی ہے۔ روایتی طور پر اس سال بھی ایک پروقار جلسے کا انعقاد کیا گیا اور مزار غالب پر گل پوشی کی گئی۔ اس موقع پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے غالب اور دانش حاضر کے عنوان سے ایک خصوصی لیکچر دیا۔ انھون نے اپنے لیکچر میں کہا کہ غالب کی شاعری کے ہر دور میں حقائق کے بارے میں حکیمانہ غور وخوض اور سنجیدہ رائے زنی کا رویہ ملتا ہے۔ پرانے انداز نقد کی طرح ان کی شاعری کو محض خیال کی ندرت اور لب ولہجہ کی انفرادیت کے دائرے میں سمیٹنا آسان نہیں۔ انسان کے طرز وجود پر خور خوض، احتساب ذات اور تجربے کی پیچیدگی جیسے نکات اور رویوں کو سمجھے بغیر محض روایتی انداز میں نہ تو غالب کی تفہیم وتعبیر کا حق ادا کیا جا سکتا ہے اور نہ ان کے امتیازات کی نشان دہی کی جاسکتی ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ زمانہ حاضر کا انسان اپنی عزتِ نفس ،خودداری، اپنے طنطنے اور رکھ رکھاؤ کے معاملے میں اپنے آبا واجداد سے زیادہ حساس ہے۔ انسان کو اس کی عظمت اور برتری کا احساس اس کو متوازن اور معتدل رکھنے کی کوشش بھی کرتا ہے مگر کیا یہ حقیقت نہیں کہ اس کی وحشت، اس کا خوف، اس کی حیرت اور اس کی فطری بے اطمینانی اسے غالب کی زبان میں ایک '' آہوے صیاد دیدہ'' کے مصداق بنائے ہوئے ہے۔ اس پورے پس منظر میں دانش حاضر کے لیے مرزا غالب کی شاعری کی معنویت ماضی کے کسی بھی زمانی حوالے سے زیادہ معلوم ہوتی ہے اور وہ اردو کے کسی بھی شاعر کے مقابلے میں موجودہ زمانے کی آگہی اور معاصر صورت حال کے بہتر ترجمان دکھائی دیتے ہیں۔ اس موقع پر پروفیسر شمیم حنفی نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ غالب کے بارے میں یہ خیال بہت عام ہے کہ انھوں نے اردو کی شعری روایت کو ایک نئے شعور سے روشناس کرایا اس طرح وہ اردو میں جدید تہذیبی نشاۃ ثانیہ کے پہلے نمائندے کہے جا سکتے ہیں۔ صنعتی انقلاب کے نتیجے میں ہندوستان کی اجتماعی زندگی جس تہذیبی ماحول سے دوچار ہوئی اس کے مسائل ہماری روایتی تہذیب کے مسائل سے بہت مختلف

تھے۔جدید تہذیب نے ایک نئے شعور ایک نئی فکر اور زندگی ایک نئے اسلوب کی بنیادیں مستحکم کیں.اس کے ساتھ ذہنی مسئلوں اور آزمایشوں کا ایک نیا سلسلہ بھی سامنے آیا۔غالب کی حسیت اپنے معاصرین اور پیش رؤں کی بہ نسبت جدید زندگی کی پیچیدگیوں کا احاطہ زیادہ موثر انداز میں کرتی ہے۔وہ نئے نئے سوال قائم کرتے ہیں۔دانش حاضر کے مسائل کا اتنا گہرااور مربوط ان کے معاصرین میں اور کسی کے یہاں نہیں ملتا۔اس موقع پرڈاکٹرعقیل احمد نے کہا کہ غالب اکیڈمی نے غالب کے یوم ولادت کا جلسہ شروع کیا تھا اب ہندوستان ہی نہیں پوری دنیا میں غالب کے یوم ولادت کے جلسے ہونے لگے۔غالب پر ہرسال لیکچر سیمینار ہوتے رہتے ہیں لیکن جب بھی غالب پر بات کی جاتی ہےتو اس میں ایک نئی تازگی ہوتی ہے ہر مقالے اور ہر پرچے میں نیا پن ہوتا ہے۔ غالب کی شاعری ہی اتنی پہلودار ہے کہ ہر بار نئے پہلو سامنے آتے ہیں۔جلسے کی صدارت پروفیسر جینا بڑے نے کی۔جلسے میں بڑی تعداد میں علمی وادبی شخصیات یونیورسٹیوں کے طلباواساتذہ موجود تھے جن میں ڈاکٹر یونس جعفری،ڈاکر خالد علوی،علیم الدین اسعدی،شہباز ندیم ضیائی،انجم عثمانی،سکندر عاقل،جے سی بترا،سنتوشکمار،نسیم عباسی فضل بن اخلاق کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

✿✿✿

غالب اکیڈمی میں 19رجنوری 2014 کومولانا حالی پرسیمینار:۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے تعاون سے غالب اکیڈمی ،نئی دہلی میں خواجہ الطاف حسین حالی پر کل ہند سیمینار کا انعقاد کیا گیا جس کے پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر شمیم حنفی اور پروفیسر قاضی جمال حسین نے کی۔ پہلے اجلاس میں علی گڑھ کے آفتاب عالم نے ”حالی اور لفظ تنقید“ کی تحقیق کے عنوان سے مقالہ پڑھتے ہوئے کہا کہ تنقید کی تحقیق صرف بیس سال کے عرصے پر محیط ہے۔جناب نسیم عباسی نے اپنے مقالے میں ”یادگار غالب“ میں کہا کہ یادگار غالب کو کیس اسٹڈی کہا جاسکتا ہے۔یادگار غالب نے غالب پر افہام وتفہیم کے لیے مطالعے کے دروازے کھول دیے۔حالی غالب کی فارسی شاعری کے بارے میں جو کچھ لکھ گئے اس سے آگئے ابھی بڑھانہیں جاسکا۔پروفیسر سلیل مسرا نے حالی کی حب وطن پر اپنے مقالے میں کہا کہ حالی کی شاعری نے پرانے

سے نئے کو جوڑنے کا کام کیا۔ ہندی نظم بھارت بھارتی حالی کی مسدس سے متاثر ہو کر لکھی گئی۔ انھوں نے سوشل شاعری کی۔ حالی نے شاعری میں تاریخ کا استعمال کیا۔ ان کے یہاں متحدہ قومیت، نیشن وغیرہ کا واضح تصور ملتا ہے۔ مظہر محمود نے مسدس مدوجزر اسلام پر مقالہ پڑھتے ہوئے کہا کہ مدوجزر اسلام کی ضرورت اہمیت، معنویت وافادیت جتنی عہد حالی میں تھی آج بھی اس سے کم نہیں ہے۔ پروفیسر ابن کنول نے حالی کی نثر نگاری پر مقالہ پڑھتے ہوئے یادگاری غالب، حیات سعدی، حیات جاوید، مقدمہ شعروشاعری کو یادگار قرار دیا۔ پہلے اجلاس کی صدارتی تقریر کرتے ہوئے پروفیسر قاضی جمال حسین نے کہا کہ حالی کے یہاں آنکھوں کو خیرہ کردینے والی بات ہے۔ گہرائی ہے۔ وہ مسئلے کی تہہ میں پہنچ جاتے ہیں۔ ان کی شخصیت موہنی ہے۔ بہت اچھے وضع دار انسان تھے۔ غالب کی جوخصوصیات حالی نے بیان کردی۔ اس میں اضافہ نہیں ہوسکا۔ انھوں نے شاعری کو بے وقت کی راگنی کہا اور اسی میں اچھی شاعری کی۔ اس موقع پر پروفیسر شمیم حنفی نے اپنی تقریر میں کہا کہ گاندھی جی نے حالی کی مناجات بیوہ سن کر کہا تھا کہ ہندوستان کی قومی زبان مناجات کی زبان ہونی چاہیے۔ پہلے اجلاس کی نظامت ڈاکٹر ممتاز عالم رضوی نے کی۔ دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر عبدالحق اور پروفیسر قاضی افضال حسین نے کی۔ دوسرے اجلاس میں شاداب تبسم نے غالب کی مکتوب نگاری، ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے حالی اور تعلیم نسواں، پروفیسر قاضی جمال حسین نے حالی اور جدید نظم کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ ضیاء الرحمٰن صدیقی نے اپنے مقالے میں کہا کہ چپ کی داد حالی کی ایک ایسی شاہکار نظم ہے جوان کے تعلیم نسواں اور مساوات نسواں کے نظریے کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔ دوسرے اجلاس کی صدارتی تقریر میں پروفیسر افضال حسین نے کہا کہ حالی نے غیر شعوری طور پر مادے پر خیال کو فوقیت دی حالی نے اپنی سوانحی کتابوں میں جو عنوانات قائم کئے آج تک اسی پر پی ایچ ڈی کے تھیسس لکھے جارہے ہیں۔ ضرورت ہے کہ متن میں اتر کر دیکھا جائے۔ دوسرے اجلاس کی نظامت عبدالسمیع نے کی۔ سیمینار کے آخری اجلاس کی صدارت پروفیسر قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی نے کی اور پروفیسر عبدالحق، پروفیسر قاضی افضال حسین اور ڈاکٹر شمس تبریزی نے مقالے پیش کئے۔ پروفیسر عبدالحق

نے دیوان حالی کا نقش اول کے عنوان سے مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ حالی کے دیوان کی بار بار اشاعت سے متن میں تبدیلیاں بھی غیر شعوری طور پر داخل ہوتی رہیں۔ اسے ازسرنو مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔ پروفیسر قاضی افضال حسین نے اپنے مقالے اردو تنقید کا مسئلہ میں کہا کہ قطعی غیر ادبی اسباب کے سبب حالی نے اپنے کلاسیکی متون کی تقدیر کا تناظر بدل دیا۔ اس موقع پر پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی نے کہا کہ حالی جس دور میں جی رہے تھے وہ ذہنی انتشار کا زمانہ تھا اس دور میں حالی نے نئی راہیں نکالیں۔ تیسرے اجلاس کی نظامت ڈاکٹر سلمیٰ شاہین نے کی۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے رکن جناب علیم الدین اسعدی نے شکریہ ادا کیا۔ جناب متین امروہوی اور ڈاکٹر احمد علی برقی نے اس موقع پر منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ اس موقع پر بڑی تعداد میں دہلی کے ادبا و شعرا نے شرکت کی جن میں ڈاکٹر ارجمند آرا، ڈاکٹر شعیب رضا خاں، محمد ظہیر برنی، شہباز ندیم ضیائی، احمد علوی، ایم آر قاسمی، محمد خلیل، ڈاکٹر ابوبکر عباد، سلیم امروہوی، مقبول نیازی، ڈاکٹر نگار عظیم، فرمان چودھری، کنیز وارثی، ڈاکٹر شمع افروز زیدی، قاسم سید، حبیب سیفی وغیرہ کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

❁❁❁

15رفروری 2014 کو مرزا غالب کے 145ویں یوم وفات کے موقع پر غزل سرائی:۔

مرزا غالب کے 145 ویں یوم وفات کے موقع پر غالب اکیڈمی، نئی دہلی میں سکنڈری اور سینئر سکنڈری کے طلبا کی غزل سرائی مقابلے کا انعقاد کیا گیا اس میں دہلی کے مختلف اسکولوں کے چھتیس طلبا نے غالب کی غزلیں پیش کیں۔ اس مقابلے میں شرکت کرنے والے سبھی طلبا کو دیوان غالب اور سند بطور انعامات بدست پروفیسر شمیم حنفی تقسیم کئے گئے۔ نسیم عباسی اور ڈاکٹر نگار عظیم نے جج کے فرائض انجام دیے۔ اس موقع پر پروفیسر شمیم حنفی نے طلبا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اردو کئی قوموں اور تہذیبوں کی ترجمانی کرتی ہے اردو میں سب کو تلفظ کی تربیت دی جانی چاہیے اردو یکجہتی رواداری اور روشن خیالی کی زبان ہے۔ جو بچے دو زبان جانتے ہیں وہ دو بچوں کے برابر ہیں۔ کسی طرح تعصب نہیں ہونا چاہیے۔ اس موقع پر ڈاکٹر نگار عظیم نے کہا کہ غالب کی غزلیں سب بچوں نے اپنے اپنے انداز میں پیش کیں۔ کسی کی نغمگی اچھی تھی تو کسی کا تلفظ مجموعی طور پر سب کی

کارکردگی بہت اچھی تھی۔ طلبا ان کے اساتذہ قابل مبارکباد ہیں۔

۞۞۞

21 فروری کو غالب اکیڈمی کے 45ویں یوم تاسیس اور غالب کے 145ویں یوم وفات کے موقع پر محفل کلام غالب کا انعقاد

غالب اکیڈمی، نئی دہلی میں غالب کے 145ویں وفات اور غالب اکیڈمی کے 45ویں یوم تاسیس کی مناسبت سے محفل کلام غالب کا انعقاد کیا گیا۔ جس میں بیگم اختر کی سب سے چھوٹی شاگردہ ریکھا سوریہ نے غالب کی غزلیں موسیقی کے ساتھ پیش کیں۔ جس سے بیگم اختر کی یاد تازہ ہوگئی۔ اس موقع پر بڑی تعداد میں لوگ موجود تھے جن میں پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر نصیر احمد خاں، پروفیسر شریف حسین قاسمی، نسیم عباسی، متین امروہوی، جتندر لال وارثی، فضل بن اخلاق، انور علی قاسمی، مفتی شوکت، علیم الدین اسعدی، معین جے پوری، شہباز ندیم ضیائی، محمد سلیم، تنویر احمد، یوسف، درود دہلوی، وغیرہ کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

۞۞۞

غالب اکیڈمی کے 45ویں یوم تاسیس اور غالب کے 145ویں یوم وفات کے موقع پر طرحی مشاعرے کا انعقاد۔

22. فروری 2014 کو غالب اکیڈمی، نئی دہلی میں مرزا غالب کے 145ویں یوم وفات اور غالب اکیڈمی کے 45ویں یوم تاسیس کے موقع پر ایک طرحی مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس کا افتتاح پروفیسر شمیم حنفی نے کیا اور گلزار دہلوی نے مشاعرے کی صدارت کی، نظامت کے فرائض فاروق ارگلی نے ادا کیے، کچھ اشعار پیش خدمت ہیں۔

اب تو غالب کو سکون قلب ملنا چاہئے — اب تو شاید آرزو دل میں نہاں کوئی نہ ہو — گلزار دہلوی
پہلا سا زورِ گریہ نہیں وائے چشم نم — دامن کو یہ گلہ ہے ابھی تر نہیں ہوں میں — وقار مانوی
کل پاؤں کہہ رہا تھا نہیں ہوں میں تیرا پاؤں — اب سر یہ کہہ رہا ہے ترا سر نہیں ہوں میں — فرحت احساس
میں ہوں نگینہ اس کی انگوٹھی کا اے متین — رہ میں پڑا ہوا کوئی پتھر نہیں ہوں میں — متین امروہوی
حقیقت کا مظہر صداقت کا درپن — نہ تم دیکھتے ہو' نہ ہم دیکھتے ہیں — ابرار کرت پوری
سمجھتے نہیں ہیں قلندر کی عظمت — وہ بس شہ کا جاہ وحشم دیکھتے ہیں — اسد رضا
اس نے آئینۂ دل توڑ دیا ایسا کمال — ٹکڑا ٹکڑا جو چنوں بھی تو ملائے نہ بنے — کمال جعفری

یوں سرسری نگاہ کی ٹھوکر سے مت پرکھ ہے دیدہ ور تو دیکھ! کہ پتھر نہیں ہوں میں ظفر مرادآبادی
حقیقت تو باہیں پسارے کھڑی ہے مگر اس طرف لوگ کم دیکھتے ہیں فاروق ارگلی
یوں جابجا ہوں جیسے کہیں پر نہیں ہوں میں آخر کو ہوں بھی جائے مقرر نہیں ہوں میں احمد محفوظ
مجھ کو برا کہو گے برا مان جاؤں گا معمولی آدمی ہوں پیمبر نہیں ہوں میں شہپر رسول
جس کی تعمیر میں شامل ہے مرا خون جگر قصرِ دل اپنے ہی ہاتھوں سے وہ ڈھائے نہ بنے احمد علی برقی
کیمپ میں آتے ہیں وہ درد بانٹنے کے لیے مو سیاست کی مگران سے چھپائے نہ بنے ممتا کرن
نظر ہم کو آئے ہے جنت وہیں ماں جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں قیصر عزیز
ہم ان کے سراب تلطف کی جانب حقارت سے با چشم نم دیکھتے ہیں سلمٰی شاہین
ہر اک چمکتی چیز کا خوگر نہیں ہوں میں دنیا تیرے خیال سے بہتر نہیں ہوں میں سکندر عاقل
ہمیں یوں تو اپنا وہ کہتے ہیں لیکن ہماری ہی جانب وہ کم دیکھتے ہیں سلیم امروہوی

ان کے علاوہ افضل منگلوری، شہباز ندیم ضیائی، نسیم عباسی، ایس یوظفر، شمس رمزی، شریف شہباز، اسلم بقائی، جاوید قمر نے بھی اشعار پیش کیے۔

✡✡✡

23 فروری 2014 کو غالب اکیڈمی میں غالب کی دلی اور دلی والے سیمینار کا انعقاد:۔

غالب اکیڈمی کے 45 ویں یوم تاسیس کے موقع پر غالب کی دلی اور دلی والے کے عنوان سے ایک سیمینار کا انعقاد کیا گیا جس کا افتتاح پانچ سو برس سے آباد خاندان کے چشم و چراغ سابق چیف الیکشن کمشنر ڈاکٹر ایس وائی قریشی نے کیا۔ انھوں نے کہا کہ دلی دارالسلطنت ہونے کی وجہ سے برباد ہوتی رہی ہے۔ کیونکہ باہر سے آنے والے راجدھانی کو ہی متاثر کرتے ہیں۔ دلی کا ایک ایک چپہ اپنی ایک طویل تاریخ وتہذیب رکھتا ہے۔ حضرت نظام الدین پر ہی کئی سیریل بنائے جا سکتے ہیں۔ پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر شمیم حنفی اور پروفیسر قاضی جمال حسین نے کی۔ اس اجلاس میں پروفیسر سلیل مسرا نے غالب کے زمانے کی سماجی و معاشی حالت پر بولتے ہوئے کہا کہ غالب کے یہاں سماج کا اپنا شعور تھا غالب جس طرح کی دنیا دیکھنا چاہتے تھے وہ انھیں انگریز فراہم کرسکتا تھا۔ وہ جدید دنیا نہیں مستحکم دنیا چاہتے تھے۔ 1857ء ان کے لیے بڑا المیہ تھا۔ دستنبو کی بڑی سماجی اہمیت ہے۔ فیروز بخت نے غالب کی حویلی پر اپنا مقالہ پیش کیا اور ضمیر حسن دہلوی

نے غالب کی دلی کے عنوان سے بہت دلچسپ مضمون پیش کیا۔ فیروز دہلوی نے غالب مجروح کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ انیس اعظمی نے غالب کے ان خطوط کے اقتباسات پیش کیے جن میں دہلی کا ذکر ہے۔ پہلے اجلاس کی صدارتی تقریر میں قاضی جمال حسین نے کہا کہ غالب کی خصوصیت یہ ہے کہ 1857 میں دہلی کی بربادی پر غم کے آنسو بہانے کے ساتھ وہ اس عہد کی سچائیوں کا اعتراف بھی کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اب مغلیہ تہذیب دوبارہ واپس آنے والے نہیں۔ وہ مغلیہ تہذیب پر ماتم کرنے کے ساتھ ہی نئی تہذیب اور انگریزوں کی لائی ہوئی برکتوں کا خیر مقدم بھی کرتے ہیں۔ پہلے اجلاس کی نظامت سہیل انجم نے کی۔ دوسرے اجلاس میں عبد العزیز نے غالب اور شیفتہ، غلام یحییٰ انجم نے دہلی کی خانقاہیں اور حنا آفرین نے خطوط غالب میں دہلی کی تاریخ کے عنوان سے مقالے پیش کیے۔ صدارت کے فرائض پروفیسر عبدالحق اور پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے ادا کیے۔ پروفیسر غلام یحییٰ انجم نے دہلی کی خانقاہوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ غالب کے عہد کی سب سے اہم خانقاہ مرزا مظہر جان جاناں کی تھی جو بڑے بڑے علماء وفضلا کے لیے آماجگاہ تھی۔ سیمینار کے تیسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر شمس الحق عثمانی اور ڈاکٹر یونس جعفری نے کی اس اجلاس میں ڈاکٹر خالد علوی نے اپنے مقالے غالب کی دلی اور غالب کے دلی والے میں کہا کہ غالب کے خطوط میں دلی کے بارے میں یہاں کی گلیوں اور محلوں اور کنوؤں کے بارے میں جو تفصیلات ملتی ہیں وہ اب موجود نہیں ہیں۔ دلی کے بارے جاننے کے لیے خطوط ایک بہت بڑا ذریعہ ہیں۔ پروفیسر قاضی جمال حسین نے اپنے مقالے غالب کی دلی میں بتایا کہ ہندوستان کی تہذیبی تاریخ میں انیسویں صدی کا نصف آخر سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ مغلوں کے مستحکم اور طویل سیاسی اقتدار نے اسی عرصے میں آخری سانسیں لیں اور حرف غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے نابود گیا۔ پروفیسر عبدالحق نے غالب کے کلام میں توارد خیال کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ معید رشیدی نے غالب اور مومن مفروضات اور حقائق کے عنوان سے اپنے مقالے میں کہا کہ عام طور پر غالب کو مومن کا حریف بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ غلط ہے دونوں اچھے دوست تھے۔ دونوں میں رقابت کا کوئی جذبہ نہ تھا۔ زمرد مغل نے خدائے سخن کون کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ ڈاکٹر ارجمند آرا نے اپنے مقالے عہد غالب میں دلی کا ادبی ماحول کے عنوان سے مقالہ پیش کیا اور کہا کہ غالب کی شاعری 1857 سے پہلے مکمل ہو چکی تھی۔ پروفیسر شمس الحق

عثمانی نے کہا کہ عہد غالب پر تازہ نظر ڈالنے کی بھی ضرورت ہے اور اس بات پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ ٹیپو کی شکست بھی مسلمانوں کی حکومت کے لیے ایک بڑا المیہ تھا۔ تیسرے اجلاس کی نظامت شمیم عثمانی نے کی۔ سیمینار میں بڑی تعداد میں لوگ موجود تھے جن میں ظفر مراد آبادی، وقار مانوی، سلیم امروہوی، ریاضت علی شائق، علیم الدین اسعدی، متین امروہوی، فضل بن اخلاق، عبدالرشید، ابوبکر عباد، سلیم دہلوی، محمد اقبال، مفتی شوکت، محمد احمد، انور نزہت، شمع افروز زیدی، ڈاکٹر شعیب رضا وارثی کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ سیمینار کے آغاز میں پروفیسر شمیم حنفی نے خیر مقدمی کلمات ادا کیے اور آخر میں عقیل احمد نے شکریہ ادا کیا۔

✡✡✡

8/مارچ 2014 کو کنور مہندر سنگھ بیدی کے 105ویں یوم ولادت کے موقع پر سیمینار کا انعقاد:۔

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کے 105 ویں یوم پیدائش کے موقع پر غالب اکیڈمی، نئی دہلی میں کنور مہندر سنگھ لٹریری ٹرسٹ کی طرف سے پہلا پروقار سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ سیمینار کے پہلے اجلاس میں ڈاکٹر عقیل احمد نے اپنے مقالے میں کہا کہ کنور مہندر سنگھ بیدی 8 مارچ 1909 کو منٹگمری میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم منٹگمری میں حاصل کی سینیر کیمبرج اور بی اے کی تعلیم لاہور سے حاصل کی۔ پی سی ایس کے لیے پنجاب کے وزیر اعلیٰ سکندر حیات نے نامزد کیا۔ جالندھر، روہتک، کانگڑہ، دہلی میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد دہلی میں مستقل سکونت اختیار کی اور دہلی کی تہذیب کا حصہ بن گئے۔ جشن جمہوریت کے موقع پر مشاعرے کا آغاز انھیں کے دور ملازمت میں ہوا جو آج روایتی بن گیا۔ پروفیسر شریف حسین قاسمی نے اپنے مقالے میں کہا کہ بیدی صاحب بنیادی طور پر ایک کلچرل انسان تھے۔ انھوں نے مختلف حیثیتوں سے اپنے فرائض منصبی انجام دیے جہاں گئے تہذیب و تمدن اور اسی کے احیا وفروغ سے کاروبار زندگی چلانے کی کوشش کی اور اس میں کامیاب رہے۔ شریف الحسن نقوی اپنے مقالے اخلاص و مروت کا پیکر کنور مہندر سنگھ بیدی سحر میں کہا کہ بیدی صاحب ہشت پہلو شخصیت کے حامل تھے۔ 1947 میں انھوں نے فسادات پر اپنی انتظامی صلاحیت سے بھرپور فائدہ اٹھا کر امن وامان کے قیام میں کامیاب کوشش کی۔ اس موقع پر ڈاکٹر مولا بخش نے اپنے مضمون ایک مکمل انسان کنور

مہندر سنگھ بیدی اور ان کی غزلیہ شاعری میں کہا کہ سحر صاحب کی غزلیہ شاعری ہر چند کہ کلاسیکی آب ورنگ میں نہائی ہوئی ہے لیکن ان کی اپنی سی آواز کا اپنا سا لب ولہجہ ان کی انفرادیت کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ اس موقع پر ڈاکٹر محمد اقبال نے اپنے مقالے میں بیدی صاحب کے سنگرور کے دور ملازمت کی یاد داشتیں پیش کیں۔ اس موقع پر عمرانہ خاتون نے اور جمیل الرحمٰن نے مقالے پڑھے۔ دوسرے اجلاس میں چنڈی گڑھ سے آئے کشمیری لال ذاکر نے عالیجاہ کے عنوان سے اپنے مقالے میں کہا کہ شاعر تو وہ تھے ہی لیکن وہ ایک بہت اچھے انسان تھے اور میری نظر میں ایک بہت اچھا انسان ہونا ایک بہت اچھا شاعر ہونے سے زیادہ اہم ہے۔ اسی لیے میں نے انھیں عالی جاہ کہنا شروع کردیا۔ دوسرے اجلاس میں پیکر شرافت و انسانیت کنور مہندر سنگھ بیدی کے عنوان سے اپنے مقالے میں گلزار دہلوی نے کہا کہ کنور صاحب 1941 سے 1958 تک بالخصوص اور 1964 تک بالعموم بلا امتیاز مذہب وملت بلا تفریق صوبہ وزبان سچے پکے عاشق اردو رہے۔ جو برصغیر ہندو پاک میں مقبول ومطلوب رہے۔ اس موقع پر پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کہا کہ بیدی صاحب ادبا شعرا اور ہم سب کے سرپرست رہے۔ وہ فیاض تھے بادشاہ تھے، جب تک زندہ رہے مشاعروں کی صدارت کرتے رہے۔ ان کی شاعری میں فرقہ پرستی کو ایک مسئلے کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اس موقع پر کہا کہ اردو پر کسی کا کوئی احسان نہیں ہے۔ پنجاب اردو کا زرخیز خطہ ہے۔ الیکٹرانک میڈیا میں اردو ہے۔ اگر اردو کو ہٹا دیا جائے تو الیکٹرانک میڈیا گونگا بہرا ہو جائے گا۔ سیمینار کی نظامت شمیم عثمانی نے کی۔ اس موقع پر متین امروہوی اور کمال جعفری نے منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ کنور مہندر سنگھ بیدی لٹریری ٹرسٹ کی طرف سے نوجوان شاعر جیتندر پرواز کو پچاس ہزار روپے کا انعام بھی دیا گیا اس موقع پر بڑی تعداد میں دہلی کی ادبی شخصیات موجود تھیں۔ جن میں شہباز ندیم ضیائی، علیم الدین اسعدی، محمد سلیم، مقبول نیازی، شاداب تبسم، سفیر احمد خاں، وسیم احمد سعید، ظہیر احمد برنی، ریاض قدوائی، اسفر فریدی، قاسم سید، عادل اسیر، کے ایس بیدی، سلیم امروہوی، فضل بن اخلاق، فرمان چودھری کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ آخر میں نارنگ ساقی نے سب کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقع پر رہنمائے تعلیم جدید کا کنور مہندر سنگھ بیدی نمبر کا اجرا بھی پروفیسر گوپی چند نارنگ کے دست مبارک سے عمل میں آیا۔

✿✿✿

کتابوں کی باتیں

کتاب کا نام:	اوراق پارینہ	مصنف	:	وسیم احمد سعید
ناشر :	مولانا آزاد اکیڈمی، نئی دہلی	قیمت	:	-/350 روپے
صفحات :	374،	سن اشاعت:		2013

اوراق پارینہ کے مصنف وسیم احمد سعید نے تاریخی موضوعات پر کئی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ شان اودھ بیگم حضرت محل، کالا پانی، بلاد ہند کی داستان، گلدستہ ظرافت وغیرہ ان کی قابل ذکر تصانیف ہیں۔ انھیں تاریخی موضوعات سے خاص دلچسپی ہے۔ اوراق پارینہ میں بیس تاریخی مضامین شامل ہیں۔ مضامین کے اصل موضوعات تو تاریخی ہیں لیکن وہ ایک رخے نہیں ہیں ان میں خاصا تنوع ہے۔ پہلا مضمون انقلاب 1857: بہادر شاہ ظفر اور غالب ہے جس کا تعلق ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی 1857 سے ہے اور غالب بہادر شاہ ظفر جیسی شخصیات سے بھی اس مضمون کا تعلق ہے۔ بہادر شاہ ظفر کے تعلق سے لکھتے ہیں:

> ''بہادر شاہ ظفر نے جب باغی فوجوں کی سربراہی قبول کر لی تو پھر پوری طاقت سے انگریزوں کے خلاف جنگ لڑی اور بہ نفسِ نفیس آخر تک اس کی نگرانی کرتے رہے۔''

شخصیات کے تعلق سے اس کتاب میں اور کئی مضامین شامل ہیں جیسے جیمی گرین معمار غالب مولانا فضل حق خیر آبادی، ضیغم ہند شیر علی، جنرل بخت خاں، لیلائے آزادی حاجی بیگم، مہارانی لکشمی بائی، مولانا عبدالرحیم عظیم آبادی، مجاہد اعظم، احمد اللہ شاہ یہ سب مضامین شخصیات سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔ یہ شخصیات ہندوستان کی جنگ آزادی سے تعلق رکھتی ہیں۔

ایک مضمون اورنگ زیب کے زمانے کے صوفی سرمد شہید پر ہے۔ جن کے بارے میں مصنف نے لکھا ہے:

> ''جب تک آپ دنیا والوں میں موجود رہے درس عبرت دیتے رہے۔ ابدالی کیفیت آپ کے اندر موجود تھی۔ ہر وقت محبتِ خدا میں غرق رہتے تھے گویا کہ مجذوبانہ حالت بنی رہتی تھی۔ آپ فنافی اللہ کے درجے تک پہنچ چکے تھے۔ دنیا اور دنیا کی تمام چیزیں آپ کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھیں۔''

کتاب میں جن شخصیات پر مضامین شامل کئے گئے ہیں ان میں بعض ایسی ہیں جو بہت معروف ہونے کے باوجود ان پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ کچھ شخصیات ایسی ہیں جنھوں نے اپنا سب

کچھ قربان کر کے گمنام ہوگئیں۔ مصنف کو اس بات کا قلق ہے کہ 1857 کے معروف اور غیر معروف دونوں ہی طرح کے مجاہدین کو جان بوجھ کر بھلایا جا رہا ہے۔ اسی طرح شہروں کی تاریخ کو بھی مٹایا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں کان پور اور فیض آباد پر دو مضامین اس کتاب میں شامل کیے گئے ہیں۔ جن سے ان شہروں کے قدیم و جدید تاریخ و ثقافت کا پتہ چلتا ہے۔ فیض آبادی تہذیب کے بارے میں اس کتاب مین درج ہے۔

''فیض آباد اپنی تہذیب، شیریں زبانی اور اودھ کی پہلی دارالسلطنت ہونے کی وجہ سے ایک ممتاز شہر کا درجہ رکھتا ہے۔ فیض آباد کبھی اپنی گنگا جمنی تہذیب کا مرکز تھا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں نہ کوئی فرقہ تھا نہ مزاجی تضاد، نہ کوئی بھید بھاؤ اور نہ ہی کوئی اتار چڑھاؤ۔ تیج تہوار دونوں مل کر مناتے تھے۔''

کان پور کی قدامت کا ذکر کرتے ہوئے اس کی ابتدائی تاریخ پر اظہار خیال کرتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے کہ:

''ہوسکتا ہے، ہم کان پور کو دہلی کی طرح Seven Cities of Delhi کا درجہ نہ دے سکیں۔ لیکن اس کو Multi Towns of Kanpur ضرور کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ تاریخی نقطۂ نظر سے بٹھور، جاج مئو، مکن پور اور شیوراج پور جیسے قریبی مقامات کو کان پور سے علاحدہ کر کے تاریخ کا جائزہ نہیں لیا جاسکتا۔''

مصنف نے مضمون میں کان پور کی جو جھلکیاں پیش کیں ہیں اس کا آج تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کتاب میں شامل بیشتر مضامین کا تعلق 1857 سے جڑ جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ مشمولہ مضامین وطن پرستی اور آزادی کے سپاہیوں سے جذبۂ عقیدت سے سرشار ہوکر لکھے گئے ہیں کہیں کہیں شدید جذبے کا اظہار بھی کیا گیا ہے۔ تاریخی مضامین میں حوالے کہیں دیے گئے ہیں کہیں ان کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ مجموعی طور پر مضامین معلوماتی ہیں، لیکن تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ اوراق پارینہ کے مضامین پڑھنے کے بعد تجسس پیدا ہوتا ہے۔ یہی اس کتاب کی خوبی ہے۔

✿✿✿

کتاب کا نام:	غالب اور منٹو	مصنف :	پروفیسر شمس الحق عثمانی
ناشر :	غالب اکیڈمی، نئی دہلی	قیمت :	160/-
سن اشاعت:	2013	صفحات :	160

2012 منٹو کی پیدائش کا سواں سال تھا2012 میں منٹو پر مختلف طرح کے پروگرام منعقد کئے گئے۔ غالب اکیڈمی نے غالب کے حوالے سے منٹو کو یاد کیا۔ 2/دسمبر 2012 کو غالب اور منٹو کے عنوان سے ایک لیکچر کا اہتمام کیا۔ لیکچر مشہور ومعروف فکشن کے نقاد پروفیسر شمس الحق عثمانی نے دیا۔ پروفیسر شمس الحق عثمانی کی کتابیں بیدی نامہ اور منٹو نامہ بڑی اہمیت کی حامل ہیں دونوں کتابیں بیدی اور منٹو شناسی میں کارگر ثابت ہوئی ہیں۔ پروفیسر شمس الحق عثمانی کا ایک اور کارنامہ کلیات منٹو کی ترتیب وتدوین ہے۔ اپنے لیکچر میں پروفیسر شمس الحق عثمانی نے منٹو کی ان تحریروں کی نشاندہی کی جہاں غالب کے حوالے ملتے ہیں۔ غالب اکیڈمی کی درخواست پر شمس الحق صاحب نے ان تحریروں کو یکجا کردیا۔ جہاں جہاں غالب کا ذکر ہے۔ غالب اکیڈمی نے بہت خوبصورت انداز میں 2013 میں شائع کیا۔ کتاب کے سرورق پر غالب اور منٹو کے اسکیچ ہیں اور بیک پر منٹو اور غالب کی تحریروں کے عکس، کتاب کا تعارف پروفیسر شمیم حنفی نے لکھا ہے وہ لکھتے ہیں:

> ''غالب اور منٹو پر یہ کتاب منٹو صدی کے اختتام پر مطالعات غالب کی ایک نئی جہت کا پتہ دیتی ہے۔ پروفیسر شمس الحق عثمانی نے بڑی محنت کے ساتھ اس جہت کا احاطہ کیا ہے۔''

کتاب کے دو حصے ہیں پہلا حصہ لیکچر کا متن ہے۔ دوسرے حصے میں غالب پر منٹو کی کچھ تحریریں پیش کی گئی ہیں جیسے آگرہ میں مرزا نوشہ کی زندگی' منٹو کی کتاب تلخ ترش اور شیریں سے اخذ کیا گیا ہے۔ دوسری تحریر غالب اور سرکاری ملازمت بھی کتاب تلخ ترش شیریں سے لی گئی ہے۔ تیسری تحریر غالب اور چودھویں بھی تلخ ترش شیریں سے لی گئی ہے۔ چوتھی تحریر مرزا غالب کی حشمت خاں کی دعوت کتاب شکاری عورتیں سے لی گئی ہے۔ پانچویں اور آخری تحریر غالب چودھوی اور حشمت خاں منٹو کی کہانیوں سے ماخوذ ہے۔

ان تحریروں سے غالب کی ایک دلچسپ اور متحرک زندگی سامنے آتی ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ غالب پر بننے والی فلم جو 1955 میں جاری ہوئی تھی اس کی اسکرپٹ بھی منٹو نے لکھی تھی جس کی وجہ سے عوام میں بھی غالب کی مقبولیت بڑھی تھی۔ کتاب کے پہلے حصے میں دو بڑے تخلیق کار جو مختلف زمان ومکاں سے تعلق رکھتے تھے کی ذہنی مماثلتوں کا ذکر کرتے ہوئے درج کیا گیا ہے۔

> ''میرا خیال ہے کہ غالب سے منٹو کی ارادات اور دلچسپی صرف شخصی اور جذباتی نہیں تھی۔ محض اتفاقیہ بھی نہیں تھی۔ یہ معاملہ کچھ معنوں میں دو نابغۂ روزگار لکھنے والوں کی ذہنی مماثلت اور یگانت کا بھی تھا۔''

✿✿✿
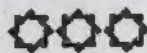
مطبوعات غالب اکیڈمی

نام کتاب	مصنف/مترجم	قیمت
دیوانِ غالب (ہندی)		100/-
دیوانِ غالب عام ایڈیشن	غالب اکیڈمی	100/-
یادگار غالب فارسی متن کے ترجمے	الطاف حسین حالی	450/-
دیوان غالب ڈیلکس		200/-
شرح دیوان غالب اردو	قاضی سعید الدین علیگ	300/-
غالب اور ہند مغل جمالیات	شکیل الرحمن	350/-
تفتہ اور غالب	ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری	35/-
شرح دیوان غالب (ہندی)	نسیم احمد عباسی	550/-
غالب اور فن تنقید	اخلاق حسین عارف	25/-
تصورات غالب	محمد عزیز حسن	35/-
انشائے مومن	پروفیسر ظہیر احمد صدیقی	25/-
مومن شخصیت اور فن	پروفیسر ظہیر احمد صدیقی	300/-
ہندوستانی رنگ	پروفیسر محمد حسن	75/-
نوائے سروش (انگریزی)	غالب اکیڈمی	40/-
اقبال/مضامین مقالات	پروفیسر اسلوب احمد انصاری	95/-
جنوب مغرب ایشیا میں رابطے کی زبان	پروفیسر محمد حسن	75/-
رقص شرر	انّ میری شمل (قاضی افضال حسین)	90/-
اردو غزل کے اہم موڑ	شمس الرحمان فاروقی	150/-
تلمیحات غالب	محمود نیازی	90/-
جہات غالب	ڈاکٹر عقیل احمد	200/-
حکیم عبدالحمید شخصیت اور خدمات	ڈاکٹر عقیل احمد	150/-
مطالعات خطوط غالب	حکیم عبدالحمید	150/-
مطالعات کلام غالب	حکیم عبدالحمید	600/-
نشاط غالب	وجاہت علی سندیلوی	150/-
اقبال اور عصر حاضر کا خرابہ	پروفیسر شمیم حنفی	150/-
مزار غالب (اردو)	شمس بدایونی	100/-
مزار غالب (ہندی)	شمس بدایونی	100/-
غالب اور اقبال کی متحرک جمالیات	یوسف حسین خاں	200/-

داخلہ جاری

اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی

غالب اکیڈمی

اردو اسپیشل اسٹڈی سینٹر

کورس و اہلیت

اردو سرٹیفکیٹ کورس :(مدت چھ ماہ، فیس مبلغ (-/1000) ایک ہزار روپے)

اس کورس میں داخلے کے لئے ہندی یا اردو کا تھوڑا بہت جاننا ضروری ہے۔ عمر اٹھارہ (18) سال سے مزید

اردو ڈپلومہ کورس :(مدت ایک سال، فیس مبلغ (-/1500) ایک ہزار پانچ سو روپے)

اس کورس میں داخلے کے لئے اردو کے ساتھ ہائی اسکول یا اگنو کا سرٹیفکیٹ کورس پاس ہونا چاہیے۔

جولائی سیشن کے داخلے کی آخری تاریخ

اردو سرٹیفکیٹ کورس :20 جون 2014

اردو ڈپلومہ کورس :20 جون 2014

فارم و پروسپکٹس اور مزید معلومات کے لیے رجوع کریں

غالب اکیڈمی

بستی حضرت نظام الدین نئی دہلی۔110013 فون نمبر:999163579,24351098

Website:http//www.ghalibacademy.org,,Email:ghalibacademy@rediffmail.com